قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1959ء

عن ابی هریره (رض)

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (ص) مَامِنَ الْاَنْبِيَاءِ نَبِيٌّ اِلَّا اُعْطِيَ مَامِثْلُهُ آمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ ۔ وَاِنَّمَا كَانَ الَّذِيْ اُوْتِيْتُ وَحْيًا اَوْحَاهُ اللهُ اِلَيَّ ۔ فَاَرْجُوْ اَنْ اَكُوْنَ اَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔

(بخاری باب فضائل القرآن ۔ جلد سوم صفحہ ۱۳۹)

رسول اللہ (ص) نے فرمایا

ہر نبی کو بقدر اُن لوگوں کے جو اس پر ایمان لائے معجزے دئے گئے ۔ لیکن میرا معجزہ وہ وحی (قرآن) ہے جو خدا نے مجھ پر بھیجی ہے ۔ (چونکہ یہ معجزہ دائمی اور تمام نوعِ انسان کے لئے ہے) اس لئے مجھے امید ہے کہ سب انبیاء سے زیادہ قیامت کے روز میری اُمت ہوگی ۔

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گل برگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے۔ آٹھ روپے
غیر ممالک سے۔ ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلیفون۔ ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

جلد ۱۲	جولائی سنہ ۱۹۵۹ء	نمبر ۷

فہرستِ مضامین

کوئی دن اور بھی جیتے ہوتے! ۲—۳
(محترم پرویز صاحب)

لمعات ۴—۸

ہماری تاریخ ۹—۳۶

ہماری مسجدیں ۳۷—۴۰

اقبال، حکیمِ انقلاب کی حیثیت سے ۴۱—۵۳
(محترم صفدر سلیمی صاحب)

خدا اور قیصر ۵۴—۵۹

ان الدین عند اللہ الاسلام ۶۱—۶۹
(محترم مرزا محمد خلیل صاحب)

حقائق و عبر ۷۰—۷۵
۱۔ فرقہ داری اور طلوعِ اسلام
۲۔ چمن میں مرے رازداں اور بھی ہیں
۳۔ سیکولر اسٹیٹ
۴۔ قربانی

رابطۂ باہمی ۷۶—۸۰

کوئی دِن اَور بھی جیتے ہوتے!

بتیس سال اُدھر کی بات ہے۔ جب میں (بسلسلۂ ملازمت) شملہ گیا تو وہاں جن دو چار احباب سے پہلے پہل تعارف ہوا ان میں جالندھر کے قریب کا بسنے والا، ایک کلرک تھا۔ سرو قامت، انداز ٹھیٹھ دیہاتی، طبیعت بے پایاں، لبوں پر ہر وقت ہنسی۔ ماتھے پر بشاشت، چہرہ شگفتہ، مزاج شاداب۔ وہ باقی احباب کی بہ نسبت تیزی سے آگے بڑھ کر میرے قریب آگیا۔ میں نے جب ذرا گہری نظروں سے مطالعہ کیا تو اس اَن گھڑ سے پیکر کے اندر ایک عجیب و غریب نرم و نازک اور صاف و شفاف شخصیت پنہاں و رواں دکھائی دی جس طرح قلب کوہسار میں کوئی حسین چشمہ قہقہہ بار ہو۔ الگ الگ پوچھئے تو اس قسم کی نرم و گرم شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق موزوں ترین الفاظ میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن بہ ہیئت مجموعی اس کا تعارف کرانا چاہیں تو خسروؔ کی طرح اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ —— اما تو چیزے دیگری۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ آپ جس قرآنی مشن کو لیکر اٹھے ہیں وہ مجھے بہت پسند ہے لیکن میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا کہ اس میں کسی طرح بھی آپ کا ہاتھ بٹا سکوں۔ البتہ ایک چیز میں نے محسوس کی ہے۔ آپ کا بہت سا وقت ایسے کاموں میں صرف ہو جاتا ہے جسے اگر کوئی دوسرا سرانجام دیدے تو آپ یکسو ہو کر اپنے کام میں منہمک رہ سکتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ایسے کام میں کیا کروں گا۔ یہ کہہ کر اس نے میرے ان کاموں کو اپنے ذمے لے لیا اور مسلسل و متواتر اکتیس سال تک اس "ڈیوٹی" کو چاند اور سورج کی سی پابندی اور ستاروں کی سی مسکراہٹ کے ساتھ سرانجام دیتا رہا۔ اس قسم کی والہانہ شیفتگی اور جنونِ خرد افروز کی مثال افسانوں میں ملے تو ملے حقیقتوں کی دنیا میں، کم از کم، میری نظر سے تو نہیں گذری۔ اس کے اس (بظاہر) سادہ سے فیصلے اور خاموش عمل نے میرے کام کی عمر کو دگنا کر دیا۔

جب سال گذشتہ میں کراچی سے لاہور منتقل ہو کر آیا ہوں تو ساری عمر میں اس سے جدائی کا پہلا موقعہ تھا۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ میرے ساتھ آنے کے لئے آمادہ ہی نہیں بلکہ مضطرب و بیقرار تھا لیکن میں نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ جب تک ملازمت سے سبکدوش نہ ہو جاؤ کراچی چھوڑنے کا خیال نہ کرو۔ اس نے میرے "جبر یا اختیار" سے اس فیصلہ کو تسلیم کیا۔ اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ گذشتہ اپریل جب وہ کنونشن میں شرکت کے لئے یہاں آیا تو مجھ سے کہا کہ اب میں ملازمت سے فارغ ہو گیا ہوں اس لئے میرے لئے یہاں جگہ کا بندوبست کیجئے۔ میں آ رہا ہوں۔ آپ یہاں تنہا ہیں۔ یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔

اسے ایک عرصہ سے مثانہ کی تکلیف تھی جس کا وہ بڑی ہمت سے مقابلہ کئے چلا آ رہا تھا۔ آخر ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اس کا آپریشن ہوگا اور ولایت میں ہوگا۔ وہ میرے پاس آ جانے کے تمام انتظامات سوچ کر گذشتہ مئی میں ولایت گیا۔ آپریشن خیریت سے ہو گیا۔ میں اس کی واپسی کی گھڑیاں گننے لگا کہ ۱۶ر جون کو دفعۃً اطلاع ملی کہ —— کیا بتاؤں کہ کیا اطلاع ملی؟ —— اطلاع

ملی کہ بھائی صاحب کا انتقال ہو گیا! یلیتنی مت قبل ھٰذا وکنت نسیا منسیا۔

سنا ہے کہ اس کا انتقال عالمِ بیہوشی میں ہوا۔ اگر وہ ہوش میں ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ فرشتۂ اجل سے بھی اپنی فطری مسکراہٹ کے ساتھ کہہ دیتا کہ میں ابھی مرنے کے لئے تیار نہیں میری موت سے "چوہدری صاحب" تنہا رہ جائینگے۔ انھیں ابھی میری بڑی ضرورت ہے۔ ہاں بھائی! تمہاری موت سے میں تنہا رہ گیا مجھے تمہاری واقعی تمہاری بڑی ضرورت تھی۔ تم نے جہاں بتیس سال گذارے تھے، کچھ دن اور بھی گذار لیتے۔ اب بات کچھ زیادہ لمبی چوڑی تو نہ تھی! کیا تم تھک گئے تھے؟ تم تو تھکنے والے نہیں تھے پھر ایسی عجلت کیا تھی! یہ ٹھیک ہے کہ بہت سے رفیق میرے ہمسفر ہیں (یہ میری خوش بختی ہے) لیکن ـــ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد

اس سے پہلے (مولانا) اسلم گئے۔ ڈاکٹر سعید گئے۔ عبدالوہاب عوام گئے۔ اب تم بھی چل دیئے۔ تمہارے جانے سے میرا بازو کٹ گیا۔

لیکن یہ وہ مقام ہے جہاں تم بھی مجبور تھے اور میں بھی مجبور ہوں۔ اسلئے جبر کی دنیا کو چھوڑ کر میں پھر اختیار کی دنیا کی طرف آتا ہوں۔ جس حد تک اللہ کا قانونِ کائنات مجھے مہلت دے گا میں اپنے مقصدِ پیشِ نظر کے حصول میں کوشاں رہوں گا اور اس کے بعد پھر تم سے آملوں گا یہی قرآن کی تعلیم ہے اور اس پر کاربند رہنا ہمارا شعار۔ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔

اللہ تمہاری مسکراہٹوں کو زندہ و پائندہ رکھے۔ اسی میں ہماری خوشی ہے۔

جگر نگار

پرویز

مرحوم دوست نے پہلے دن سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں ـــ اور میری طرح چند اور احباب ـــ اُسے "تم" کہہ کر پکاریں اور وہ "آپ" کہہ کر جواب دے۔ اس نے اس اندازِ تخاطب پر ہمیشہ اصرار کیا کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ جو یگانگت اور محبت "تم" کہنے میں پائی جاتی ہے وہ "آپ" میں مفقود ہو جاتی ہے۔ اس نے اس پر ہمیشہ اصرار کیا اس لئے میں نے اسے مرنے کے بعد بھی اسی انداز سے مخاطب کرنا مناسب سمجھا ہے ورنہ تعظیم اور احترام کے کون سے الفاظ و القاب ہیں جو ایسے دوست پر سے نچھاور نہیں کئے جا سکتے!

پھر اس نے مجھے پہلے دن "چوہدری صاحب" کہا اور ساری عمر انہی الفاظ سے پکارتا رہا۔ وہ کہا کرتا تھا "مجھے وہ پہلے دن والے چوہدری صاحب پسند ہیں۔ میرے لئے وہی مخصوص رہنے چاہئیں۔ "پرویز" باقی دنیا کے لئے رہے گا۔"

(اُف! اس البڑ دیہاتی کے انداز کس قدر پیارے تھے؟ انہی کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔)

جولائی ۱۹۵۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

حکومتِ پاکستان نے اس ماہ دو ایک ایسے فیصلے کئے ہیں جن کے نتائج بڑے دور رس اور جن کا تعلق پاکستان کے مستقبل سے بہت گہرا ہے۔ پہلا فیصلہ اُس اسکیم کے سلسلہ میں ہے جسے بنیادی جمہوریتوں (BASIC DEMOCRACIES) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مقصد اس اسکیم سے یہ ہے کہ ملک میں تنظیم نو کا ایک ایسا جال بچھا دیا جائے جس کی رو سے، مملکت کا ہر فرد، نظم و نسق حکومت میں حصہ لے سکے۔ چند دیہات کی ایک وحدت قائم کر کے اس میں پنچایت بنا دی جائے۔ یہی وحدتیں تحصیل کی وحدت سے جا کر مل جائیں۔ تحصیلوں کی وحدتیں اضلاع سے اور اضلاع کی کمشنریوں سے۔ اسی طرح یہ سلسلہ نیچے سے اوپر تک مسلسل چلا جائے۔ اس اسکیم کی تفاصیل ابھی متعین نہیں ہوئی ہیں لیکن اصولی طور پر جو کچھ (ابھی تک) طے پایا ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اس سے مملکت کا ہر باشندہ کسی نہ کسی رنگ میں کاروبارِ مملکت میں دخیل ہو سکیگا اور یہی جمہوری نظام کی اصل و بنیاد ہے۔

کچھ برس اُدھر کی بات ہے، طلوعِ اسلام نے لکھا تھا کہ نظم و نسقِ مملکت کا جو تصور قرآن پیش کرتا ہے اس کی رُو سے حکومت کسی خاص گروہ یا پارٹی تک محدود ہو کر نہیں رہتی۔ اس کا دائرہ ساری ملت کو اپنے اندر لے لیتا ہے۔ اس نے جب کہا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰) "تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو" تو اس میں بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ (جس کے لئے اسلامی مملکت وجود میں آتی ہے) ساری امت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے نہ کہ کسی خاص پارٹی کا۔ اس لئے وہی حکومت اسلامی کہلا سکیگی جس میں ہر فردِ مملکت کسی نہ کسی شکل میں شریکِ حکومت ہو۔ اس کے لئے ہم نے تجویز کیا تھا کہ ملک میں جس انداز

سے مساجد پھیلی ہوئی ہیں، ان کی رُو سے ایک نئی تنظیم وجود میں لائی جائے۔ ہر مسجد کو اس سے ملحق محلہ کے افراد کے لئے جمہوریت کی وحدت قرار دیا جائے۔ پھر ایک خاص حلقہ کی مساجد کے نمائندگان کی ایک وحدت (UNIT) قائم کی جائے۔ پھر ان نمائندگان کے ترجمانوں پر مشتمل ایک کونسل متشکل کی جائے۔ یہ کونسل نمائندگانِ حکومت کے تعاون سے اُس بستی کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے۔ اسی طرح بستیوں سے اس سلسلہ کو وسیع کرتے کرتے مرکز تک پہنچا دیا جائے۔ یہ تھی مختصراً وہ اسکیم جسے ہم نے عرصہ ہوا پیش کیا تھا۔ اس زمانے کی حکومتوں کو چونکہ جمہوری مقاصد سے چنداں دلچسپی نہ تھی اس لئے کسی نے اس اسکیم کو درخورِ توجہ نہ سمجھا۔ بایں ہمیں خوشی ہوئی کہ موجودہ حکومت نے جمہوری نظام کے اس بنیادی تصور کی اہمیت کو محسوس کرکے اسے عملی شکل دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اگر اس اسکیم کو صحیح انداز سے بروئے کار لایا گیا تو اس کے نتائج بڑے دور رس ہوں گے۔ یہ اسکیم اُس قرآنی نظامِ حکومت کی بنیاد بن سکتی ہے جس میں "کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں ہوتا"۔ لیکن اس کی کامیابی کے لئے دو ایک باتیں نہایت ضروری ہیں۔ پہلی بات یہ کہ ہمیں یہ تصور نہیں کر لینا چاہیئے کہ ہمارے عوام کی تعلیم و تربیت کی جو موجودہ سطح ہے وہی جمہوری نظام کے لئے کافی ہے۔ نبی اکرمؐ (کہ جنہوں نے دنیا میں صحیح جمہوریت کا نقشہ پیش فرمایا تھا) کا فریضہ یہ بھی تھا کہ یُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲/۲) آپؐ لوگوں کی قلب و دماغ کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام فرماتے تھے۔ انہیں کتاب و حکمت (قانونِ خداوندی اور اس کی غرض و غایت) کی تعلیم دیتے تھے۔ اور اس طرح انہیں اس قابل بناتے تھے کہ وہ نظم و نسقِ مملکت میں حصہ لینے کے اہل ہو سکیں۔ یہ اُسی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ اونٹ چرانے والی قوم دنیا کو جہانبانی و جہاں داری کے اسرار و رموز سکھانے کے قابل ہو گئی۔ لہٰذا حکومت پاکستان کے لئے ضروری ہے کہ وہ بنیادی جمہوریتوں کی اسکیم کے ساتھ ساتھ عوام کی صحیح تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرے۔

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ بنیادی جمہوریتوں کی اسکیم کا تصور ہی اس بنیاد پر قائم ہے کہ ملت کو ایک وحدت (ONE UNIT) قرار دیا جائے اور اس میں نہ مذہبی فرقوں کا کوئی دخل ہو، نہ سیاسی پارٹیوں کا۔ مثلاً جب آپ ایک پنچایت قائم کریں گے تو اس میں جہاں شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، دیوبندی، بریلوی عقائد کے لوگ برابر کے شریک ہوں گے وہاں سابقہ سیاسی پارٹیوں (مسلم لیگ، ری پبلیکن، جماعت اسلامی وغیرہ) سے متعلق افراد بھی شامل ہوں گے۔ لیکن اس پنچایت میں نہ شیعہ سنی کی کوئی تفریق ہو گی اور نہ مسلم لیگی اور ری پبلکن کی کوئی تمیز۔ وہ پنچایت، ملتِ پاکستانیہ کے افراد پر مشتمل ہو گی۔ اور چونکہ اس اسکیم کا دائرہ مملکت گیر ہو گا۔ اس لئے اس کا منطقی نتیجہ یہ ہو گا کہ ملک کی سیاست ان گروہ بندیوں اور پارٹی بازیوں کی لعنت سے پاک ہو جائے گی۔ یہ نتیجہ بڑا شاندار اور نہایت درخشندہ و پائندہ نتائج کا حامل ہو گا۔ بعض لوگوں کو کہتے سنا گیا ہے کہ الیکشن کے بعد

سیاسی پارٹیوں کے دوبارہ احیاء کی اجازت مل جائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسے لوگ نہ اسلامی جمہوریت کے تصور سے آشنا ہیں۔ اور نہ ہی انھوں مجوزہ بنیادی جمہوریتوں کی اسکیم کا بغائر مطالعہ کیا ہے۔ اسلامی جمہوریت ملت گیر ہوتی ہے۔ اور اس میں سیاسی پارٹیوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ پارٹی بازی اور مذہبی فرقہ بندی قرآن کی رو سے شرک ہے۔ ہم ارباب حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ مجوزہ اسکیم کی ترتیب و تنفیذ کے وقت اس بنیادی اصول کو اجاگر کر سامنے لائیں کہ مملکت کے آئین نو میں سیاسی پارٹیوں یا مذہبی گروہ بندیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی جس جمہوریت کا نقشہ محمد رسول اللہؐ نے پیش کیا تھا اس میں نہ کوئی سیاسی پارٹی تھی نہ مذہبی فرقہ۔ یہ دونوں چیزیں بعد کی ایجاد ہیں اور خلاف کتاب و سنت۔

۲۔ پاکستان کا دارالحکومت

دوسرا قابل ذکر فیصلہ دارالحکومت کی تبدیلی سے متعلق ہے۔ حکومت نے اہم ملکی مسائل کے حل کی تلاش کے سلسلے میں جو مختلف کمیشن مقرر کر رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک کمیشن اس مقصد کے لئے مامور ہوا تھا کہ وہ مرکزی دارالحکومت کی موزونیت کے بارے میں غور و خوض کے بعد اپنی سفارشات پیش کرے۔ کمیشن نے بالآخر اپنی رپورٹ پیش کی اور مرکزی حکومت نے ۱۲ جون کو نیشنل کانفرنس میں اس رپورٹ اور اس کی سفارشات کو منظور کرتے ہوئے کراچی کی بجائے راولپنڈی کے مضافات میں پوٹھوار کی سطح مرتفع کو نئے دارالحکومت کی تعمیر کے لئے منتخب کر لیا۔

دارالحکومت پاکستان کی حیثیت سے کراچی کی ناموزونیت ایک ایسی تلخ حقیقت تھی جس پر طلوع اسلام کے صفحات پر کئی بار اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ اس شہر کی مرطوب آب و ہوا باشندگان شہر کی صحت کے لئے جس قدر ناسازگار ثابت ہوئی ہے اس کی وضاحت کی زیادہ ضرورت نہیں۔ یہ مسئلہ اس بنا پر بے حد تشویش کا باعث تھا کہ موجودہ نسل تو بُرے یا بھلے طور پر اپنے دن پورے کر کے رخصت ہو جائے گی۔ لیکن اس کے بعد اس فضا میں جو نئی پود پروان چڑھ کر مملکت کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں لے گی صحت کے لحاظ سے اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کیفیت کی تشویشناک تفصیل کا اندازہ ہماری ابھرتی ہوئی نسل کے ان نونہالوں کی مفلوج صحت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو اس وقت کراچی کے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ سوچئے کہ کچھ عرصہ کے بعد جب یہ محروم شباب نوجوان نظم و نسق مملکت اپنے ہاتھوں میں لیں گے تو قوم اور مملکت کے مستقبل کی تعمیر کن اندیشہ ہائے تاریک کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔

قوموں کے فلسفۂ عروج و زوال کے ماہرین سلطنت برطانیہ کے موجودہ زوال کے اسباب سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کس طرح دو عالمگیر جنگوں نے برطانیہ کی مسلسل دو نسلوں کو ان کے بہترین نوجوانوں سے محروم اور بے نصیب

کر ڈالا۔ اور پھر گلیڈسٹون اور چرچل کی جانشینی کے لئے نئی نسل وہ افراد میدان میں نہ لا سکی جو اُس عالمگیر سلطنت کے پرچم کو ہمت و جرأت اور فراست سے تھام سکتے جس پر چند سال قبل سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

کراچی جیسے اہم ترین مرکز میں آب و ہوا کی ناسازگاری نے جس بے دردی سے نئی نسل کے دل و دماغ اور جسمانی صلاحیتوں کو مفلوج کیا اُسے دیکھتے ہوئے ہر چشم بینا اس خدشے کو واضح طور پر نگاہوں کے سامنے پاتی تھی کہ مملکت کی ذمہ داریوں کی شایانِ شان ادائیگی کے سلسلے میں خرابیٔ صحت بتدریج ایسا اضطراب انگیز خلا پیدا کرتی چلی جا رہی ہے جو لازماً تعمیرِ مملکت کے مستقبل پر اثر انداز ہوگا اور اگر کسی ہوشمند حکومت نے دارالحکومت کو کسی صحت بخش مقام میں منتقل کرنے کا جرأت مندانہ اقدام نہ کیا تو پھر ہم بھی یقیناً انہی ناگوار نتائج سے دوچار ہو کر رہیں گے جو ان قوموں کا حصہ ہوتے ہیں جو توانائیوں سے محروم ہو چکی ہوں۔

نئی حکومت تحسین و تبریک کی مستحق ہے کہ اُس نے اس اہم مسئلہ کو قابلِ توجہ سمجھا اور کراچی کی بجائے ایک نئے اور موزوں مقام کا بحیثیت دارالحکومت انتخاب کر کے ملت اور مملکت دونوں کی مسیحائی کا حق ادا کر دیا۔ ہمیں یقین ہے کہ حکومت کا یہ فیصلہ انتہائی دانشمندانہ اور خوش آئند نتائج کا مظہر ثابت ہوگا۔ اس فیصلے کی بدولت نظامِ مملکت کے مستقبل کو ان تمام خدشات سے نجات مل جائے گی جو کراچی کی آب و ہوا کے مہلک اثرات سے اُبھر اُبھر کر منظرِ عام پر آ رہے تھے۔

اب جب کہ نئے دارالحکومت کی تعمیر کا فیصلہ منصوبہ بندی کے ابتدائی مراحل میں داخل ہو رہا ہے ہم اس سلسلہ میں حکومت کو بعض اہم امور کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں:۔

سب سے پہلی ضرورت اس امر کی ہے کہ نئے دارالحکومت کو بڑے بڑے سرمایہ داروں کے ان اثرات سے محفوظ رکھنے کی سبیل پیدا کی جائے جو کراچی میں مرکزی حکومت کے دفتری نظام پر اکاس بیل کی طرح مسلط ہو چکے تھے۔ ابھی ابھی خفیہ دولت کے اظہار کے سلسلہ میں جو اعداد و شمار عوام کے سامنے آئے ہیں۔ وہ واضح کر رہے ہیں کہ اس شہر میں آباد لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کی تعداد سینکڑوں بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اور مرکز کے دفتری نظام کا کوئی بڑے سے بڑا عہدیدار بھی دو تین ہزار ماہوار سے زیادہ مشاہرہ وصول نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جس شہر میں اتنے بڑے سرمایہ داروں کی یہ تعداد دفتری نظام کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہو وہاں مملکت کے نظام میں رشوت ستانی، احباب پروری، جلبِ منفعت، بے انصافی اور دھاندلی کا کس قدر ہولناک سلسلہ برپا ہوگا۔ اور دفتری نظام کی حالت کس قدر دگرگوں ہوگی۔ اس تلخ تجربے کی موجودگی میں یہ اشد ضروری ہوگا کہ نئے دارالحکومت میں بڑے بڑے صنعتی اور کاروباری عناصر کو آباد ہونے کا موقع نہ دیا جائے اور ہر وہ صورت اختیار کی جائے جس کی بدولت مرکزی سیکرٹریٹ ان عناصر کے اثرات سے کلیتہً محفوظ رہ سکے۔

دوسری اہم ضرورت اس سلسلہ میں یہ ہے کہ نئے دارالحکومت میں بڑے بڑے محلات تعمیر کرنے کی اجازت قطعاً نہ دی جائے۔ کراچی میں ایک ایک بنگلے پر لاکھوں روپے صرف ہوئے اور اس طرح بے حساب قومی دولت مفید کاموں میں استعمال ہونے کی بجائے ان اینٹوں اور پتھروں میں منجمد اور متحجر ہو کر رہ گئی جو بڑے بڑے سرمایہ دار اپنے عشرت کدوں کی تعمیر میں لائے۔ مناسب یہی ہوگا کہ تعمیری منصوبہ بندیوں کے سلسلہ میں تین یا چار اقسام کے کوارٹروں اور بنگلوں کا نقشہ پہلے سے ترتیب دے لیا جائے اور اُس نقشے کے مطابق جو بنگلے تعمیر ہوں وہ انتہائی سادہ اور کم خرچ ہوں۔ اور اس طرح قومی دولت کو اینٹوں اور پتھروں کی شکل میں ضائع ہونے سے بہرحال بچایا جائے۔

تیسرا مسئلہ مجوزہ شہر میں جگہ جگہ بلا اجازت مسجدوں کی تعمیر کا ہے۔ حکومت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر اس نے اس سوال کو شروع ہی سے زیر نظر نہ رکھا تو یہ اس کے لئے کراچی ہی کی طرح وبالِ جان بن جائے گا۔ کراچی کا تلخ تجربہ حکومت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ وہاں یہی ہوا کہ جس شخص نے چاہا اور جہاں چاہا مسجد کے نام پر ایک چھوٹی یا بڑی عمارت کھڑی کر دی۔ اور پھر سینکڑوں مسجدوں کی صورت میں جن کی کوئی ترتیب نہیں تھی یہ سلسلہ کراچی بھر میں پھیل گیا۔ جب حکومت نے اس نازک مسئلہ کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہا تو ہر طرف سے مذہب، خدا اور رسول کے نام پر شور مچا دیا گیا۔ اور حکومت اس مسئلہ کے حل میں کلیتہً بے بس، مجبور اور دم بخود ہو کر رہ گئی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ حکومت کے کئی منصوبے محض اس بنا پر ناکام ہو گئے کہ وہ جس پلاٹ پر کوئی نئی عمارت تعمیر کرنا چاہتی تھی اس کے مرکز یا گوشے میں مسجد ابھر آتی تھی جسے ہمارے "حامیانِ دینِ متین" کسی شرط پر بھی وہاں سے ہٹانے نہیں دیتے تھے۔

ماضی کے اس تلخ تجربے سے سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ نئے دارالحکومت کے سلسلے میں صاف اور دوٹوک طور پر حکومت کو یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ کسی شخص کو بھی بلا اجازت کسی جگہ مسجد کھڑی کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اور حکومت سے باضابطہ منظوری حاصل کئے بغیر کوئی شخص نئے دارالحکومت میں مسجد یا کسی اور عمارت کی تعمیر نہیں کر سکے گا۔

یہ ہیں ہماری گذارشات نئے دارالحکومت کی تعمیر کے سلسلے میں۔ ہم نے اپنا فریضہ سمجھا ہے کہ کراچی کے تلخ تجربوں کو حکومت کے سامنے رکھ دیا جائے۔ ہمیں توقع ہے کہ وہ نئے دارالحکومت میں اِن تجربوں کو دہرانے سے اجتناب کرے گی۔

رشتہ کی ضرورت

ایک صاحب ثروت شخص کیلئے جن کی بیوی فوت ہو چکی ہے رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے۔ بیوہ یا کنواری ہو۔ عمر ۴۵ سال سے اوپر ہو خط و کتابت راز میں رہے گی۔
ع۔ معرفت طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے
جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔

(علامہ اقبال۔ خطبات انگریزی ص ۱۴۴)

ہماری تاریخ

میں کیا لکھا ہے؟

اِسے غور سے پڑھیئے

شائع کردہ:۔ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

ہماری تاریخ

تاریخ بھی عجیب دودھاری تلوار ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس اس کی صحیح تاریخ موجود ہے تو وہ قوم اپنے ماضی کے تجربات کے آئینہ میں اپنے حال کو درخشندہ اور مستقبل کو تابندہ بنا سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کی تاریخ غلط ہے تو وہ غلط فہمیوں اور خوش عقیدگیوں کی ایسی اندوہناک تاریکیوں میں گھری رہتی ہے جن سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ہمارے زوال کے اسباب میں بنیادی عنصر ہماری غلط تاریخ ہے۔

ہمارے پاس خدا کی کتاب ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے (اور علیٰ وجہ البصیرت اور مبنی علی الحقیقت ایمان) کہ وہ ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر زمانے میں ہماری صحیح راہ نمائی کرنے کے لئے مکمل اور کافی ہے۔ اگر ہم اس کا اتباع کریں تو ہمیں اقوامِ عالم کی امامت مل سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کی راہ نمائی ہمارے لئے اسی صورت میں نفع بخش ہو سکتی ہے جب ہم اسے سمجھیں۔ لیکن قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری غلط تاریخ ہے۔ یہ بات شاید آپ کے نزدیک تعجب انگیز اور حیرت خیز ہو۔ لیکن جب حقائق آپ کے سامنے آئیں گے تو آپ اس کی صداقت کو بلا تامل تسلیم کر لیں گے۔ قبل اس کے کہ ہم اس کی کچھ مثالیں آپ کے سامنے پیش کریں، تمہیداً یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ تاریخ کس طرح قرآن کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

قرآن فہمی کے راستہ میں رکاوٹ

مثلاً قرآن کریم جس معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کے افراد (جماعتِ مومنین) کی خصوصیات میں یہ بھی بتاتا ہے کہ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲/۳) جو کچھ انہیں خدا کی طرف سے سامانِ زیست ملتا ہے وہ اسے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ دوسرے مقام پر اس کھلا رکھنے یا دوسروں کو دیدینے کی تصریح ان الفاظ سے کر دی کہ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ اے رسول! جماعتِ مومنین کے افراد تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم اپنے مال و دولت میں سے کس قدر دوسروں کو دیں؟ جواب میں کہا گیا ہے قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ ان آیات سے

واضح ہے کہ قرآنی معاشرہ میں افرادِ معاشرہ اپنی محنت کی کمائی میں سے صرف اسی قدر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں جو ان کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس سے زائد قرآنی نظام (یا اسلامی مملکت) میں چلا جائے گا جو اسے نوعِ انسان کی ربوبیت (پرورش) کے لئے صرف کرے گا۔ ان آیات کا مفہوم سمجھنے میں نہ کوئی دقت پیش آتی ہے نہ دشواری۔ نہ ان میں کوئی اشکال ہے نہ اغلاق۔ لیکن آپ جب یہ آیات کسی کے سامنے پیش کریں تو وہ جواب میں کہہ دیتا ہے کہ فلاں صحابیؓ کے پاس لاکھوں درہم و دینار تھے۔ فلاں کے پاس چاندی اور سونے کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ فلاں کے پاس کارواں در کارواں سامانِ تجارت رہتا تھا۔ اگر کوئی شخص ضرورت سے زائد دولت اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تو ان حضراتؓ کے پاس اس قدر دولت کیوں جمع رہتی تھی۔ اس کے بعد سلسلۂ کلام کچھ اس انداز کا ہوتا ہے۔

وہ صاحب:۔ فرمایئے! صحابہ کبارؓ قرآن کو صحیح طور پر سمجھتے تھے یا آپ بہتر سمجھتے ہیں؟

آپ:۔ میں تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں صحابہ کبارؓ سے زیادہ قرآن سمجھتا ہوں۔

وہ صاحب:۔ کیا صحابہ کبارؓ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے یا ان کا عمل اس کے خلاف تھا؟

آپ:۔ معاذ اللہ! میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا عمل قرآن کے خلاف تھا۔ ان کی زندگی بالکل قرآن کے مطابق تھی۔

وہ صاحب:۔ جب ان کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ اور ان کے پاس اس قدر مال و دولت جمع رہتا تھا تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی رُو سے زائد از ضرورت مال، افراد کے پاس نہیں رہ سکتا۔

اس منطق کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ سننے والے بھی فریقِ مقابل کے ساتھ متفق ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سر ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ بات بالکل ٹھیک ہے جب صحابہ کبارؓ کے پاس اس قدر مال و دولت تھا تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں دولت جمع کرنا جائز نہیں! کیا (معاذ اللہ) صحابہؓ کو اتنا قرآن بھی نہیں آتا تھا؟

آپ نے دیکھا کہ تاریخ کس طرح قرآن کے راستے میں آکر کھڑی ہو گئی؟ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ ہمارا مروجہ اسلام تمام تر تاریخ کا مرتب کردہ ہے اور اس کا بیشتر حصہ قرآن کے خلاف ہے۔ مروجہ اسلام کی کسی شق کے

نازک دلیل

متعلق آپ سند مانگئے۔ وہ سند تاریخ سے پیش کی جائے گی۔ اگر آپ کہیں کہ اس کی سند قرآن سے پیش کیجئے تو جواب میں کہہ دیا جائے گا کہ

> ہم رسول اللہ کی سیرت طیبہ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سے اس کی سند پیش کر رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر دین میں سند اور کیا ہو سکتی ہے؟ قرآن کے سمجھنے کے لئے سیرت رسول اللہ اور صحابہ کبارؓ کی حیاتِ مقدسہ کا سامنے رکھنا لاینفک ہے۔ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

یہ جواب اس قدر مسکت ہے کہ اس کے بعد آپ کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ تاریخ، دین کی سند بن گئی ہے اور

قرآن کریم ایصالِ ثواب کے لئے رہ گیا ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ تاریخ کے کسی واقعہ کی تائید قرآن کی آیت سے مل جائے تو اُس وقت قرآن کو بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جب تاریخ اور قرآن میں تضاد ہو تو سند تاریخ کو حاصل ہوگی۔ قرآن کو نہیں۔

تاریخ کی صحیح پوزیشن

جب تک ہم قرآن اور تاریخ کی صحیح صحیح پوزیشن کو نہیں سمجھتے اور انھیں اپنے اپنے مقام پر نہیں رکھتے، دین اپنی حقیقی شکل میں ہمارے سامنے نہیں آسکتا۔ قرآن کا ایک ایک لفظ اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اس میں شک اور شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے (خواہ وہ کتب احادیث میں ہو اور خواہ کتب سیر و آثار میں) اس کی پوزیشن یہ ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب نہ رسول اللہؐ نے مدوّن کرا کر امت کو دی۔ نہ خلفائے راشدین نے انھیں مرتب کیا۔ نہ ہی ان میں سے کوئی کتاب صحابہؓ کے زمانے میں مرتب ہوئی۔ حدیث کا وہ مجموعہ جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے (یعنی بخاری شریف) وہ رسول اللہ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد مرتب ہوا۔ اور تاریخ کی سب سے پہلی جامع کتاب جسے ام التواریخ کہا جاتا ہے (یعنی تاریخ طبری) رسول اللہؐ کی وفات کے قریب تین سو سال بعد لکھی گئی۔ اُس وقت بھی کوئی تحریری ریکارڈ نہیں تھا جن سے ان کتب احادیث و تاریخ کو مرتب کیا گیا ہو۔ یہ یکسر ان باتوں پر مشتمل تھیں جو انھوں نے ہم عصر لوگوں کی زبان سے سُنیں۔ یہ ہے ہماری تاریخ کی اولیں کتابوں کی پوزیشن جن سے ہم سیرت رسول اللہؐ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سے واقف ہوتے ہیں (واضح رہے کہ نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کا بیشتر حصہ اور صحابہ کبارؓ کی خصوصیات کبریٰ خود قرآن کریم میں بھی مذکور ہیں لیکن اس وقت ہم سیرت و آثار کے اس حصے کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں جو کتب احادیث و سیر وغیرہ میں درج ہے)۔

قرآن اور تاریخ کی جو پوزیشن اوپر بیان کی گئی ہے۔ اس سے ہر صاحب بصیرت اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جب بھی قرآن کے کسی بیان اور عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ کی تاریخ کے کسی واقعہ میں تضاد نظر آئے تو قرآن کے بیان کو صحیح اور تاریخ کے واقعہ کو غلط قرار دینا چاہیئے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ماہرہ ہے جس کے لئے کسی دلیل و شہادت کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنی آپ دلیل ہے۔

قرآن اور تاریخ کا باہمی تعلق

اب رہے تاریخ کے وہ بیانات جن کے متعلق قرآن خاموش ہے۔ تو ایسی صورت میں بھی ہمارے لئے اصولِ کار واضح ہے۔ یعنی

(۱) ہمارا ایمان ہے (اور قرآن اس کی شہادت دیتا ہے) کہ نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔

(۲) لہٰذا اگر تاریخ میں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کے متعلق کوئی ایسی بات ملتی ہے جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے

تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہیئے کہ تاریخ کا وہ بیان صحیح نہیں۔

اس طرح دین کا صحیح تصور بھی قائم ہو جائے گا اور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت پاکیزہ اور حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آجائے گی۔

جو کچھ ہم نے (نظری طور پر) اوپر کہا ہے وہ واضح انداز میں سمجھ میں نہیں آسکتا۔ جب تک تاریخ سے اس کی کوئی

ایک مثال مثال نہ پیش کی جائے۔ ہم عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی تاریخ سے اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں (اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے) اس لئے ہم اس ضمن میں صرف ایک واقعہ پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ یہ وہ واقعہ ہے جو اُس وقت پیش آیا جب نبی اکرمؐ نے اس دنیا میں آخری سانس لیا۔ اور ہنوز آپؐ کے جسد طیب کو سپرد خاک بھی نہیں کیا گیا۔ اور اس کا تعلق صحابہ کبارؓ کی اُس پوری جماعت سے ہے جو اُس وقت مدینہ میں موجود تھی۔

پہلے اس سلسلہ میں قرآن کی تعلیم کو سامنے لائیے۔ قرآن کی بنیادی قدر اور غیر متبدل اصول یہ ہے کہ وَ

قرآن کے غیر متبدل اصول لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے ہر انسانی بچہ کو، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یعنی اس میں حسب نسب امیر غریب۔ رنگ اور وطن۔ مذہب و ملت کی کوئی تمیز نہیں۔

(۲) واجب التکریم ہر انسانی بچہ ہے۔ اب رہا مختلف افراد کے مدارج کا تعین، سو اس کے لئے اصول یہ ہے کہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹) ہر ایک کا درجہ اس کے کاموں کے مطابق متعین کیا جائے گا۔ بالفاظ دیگر مدارج کا تعین، جوہر ذاتی اور اعمال کی بنا پر ہوگا۔ اس میں بھی خاندان، قبیلہ، ذات، گوت، رشتہ داری، امارت، غرضیکہ کسی اضافی نسبت کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔

(۳) اسی اصول کے مطابق، امت میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوگا جو قوانین خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہوگا جس کی سیرت و کردار سب سے زیادہ قرآن کے مطابق ہوں گے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۴۹/۱۳)

ان غیر متبدل اصولوں کی رُو سے قرآن نے رنگ۔ نسل۔ خون۔ قبیلہ۔ ذات وغیرہ کے تمام امتیازات ختم کر دیئے۔ اور عزت و تکریم کا صرف ایک معیار باقی رکھا۔ یعنی جوہر ذاتی اور حسن سیرت و کردار۔

اُمت کا فریضہ اب آگے بڑھیئے۔ نبی اکرمؐ نے قرآنی اصولوں کے مطابق ایک معاشرہ متشکل کیا۔ ایک مملکت قائم کی۔ جس کا مقصد دنیا میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" تھا۔ چونکہ

اس نظام کو نبی اکرمؐ کی زندگی تک ہی نہیں رہنا تھا۔ اسے مسلسل آگے چلنا تھا کیونکہ اسی کا نام دین تھا۔ اس لئے اس مقصد کے لئے پوری کی پوری اُمت تیار کی گئی۔ اس امت کے متعلق قرآن میں ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.... (۳/۱۱۰) تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضۂ حیات امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

یہی وہ امت تھی جسے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ قرآن میں ہے ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا..... (۳۵/۳۲) پھر ہم نے ان لوگوں کو اس کتاب کا وارث بنایا جنہیں اس مقصدِ جلیل کے لئے اپنے بندوں میں سے چنا تھا۔ یہ امت (اس زمانے میں) مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھی جس کے پکے اور سچے ہونے کا سارٹیفکٹ خود اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ سورۂ انفال میں ہے

صحابہ کے فضائل

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (۸/۷۴)

اور جو ایمان لائے۔ اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اور جنھوں نے (انھیں) پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ یہ سب سچے اور پکے۔ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ہر قسم کی حفاظت اور عزت کا رزق ہے۔

دوسرے مقام پر ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی تھی۔ اور یہ وہ نعمتِ کبریٰ تھی جو ساری دنیا کی دولت خرچ کرنے پر بھی نہیں مل سکتی تھی (۸/۶۳) سورۂ توبہ میں ان کے متعلق ہے أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۹/۸۸) یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی ہیں جو کامیاب و کامران ہیں۔ سورۂ فتح میں خالقِ کائنات نے ان پکے اور سچے مومنینؓ کی جس والہانہ انداز میں توصیف و تعریف کی ہے وہ ان حضراتؓ کی بلندیٔ مقام کی زندہ شہادت ہے۔ دیکھئے! کہنے والے نے کس طرح جھوم جھوم کر کہا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸:۲۹)

اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم یہ ہے۔

محمد رسول اللہ اور ان کے رفقاء کی جماعت بھی کیا عجیب جماعت ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں اور آپس میں بڑے نرم دل اور ہمدرد۔ تو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے جھک جاتے اور قوانین خداوندی کے سامنے پیکر تسلیم و رضا بن جاتے ہیں۔ لیکن وہ راہبوں کی جماعت نہیں۔ وہ خدا کے قانون کے مطابق سامانِ زیست کی طلب و جستجو میں بھی مصروفِ عمل رہتے ہیں اور زندگی کے ہر معاملہ میں قوانین الٰہیہ سے ہم رنگ و ہم آہنگ رہتے ہوئے اپنے اندر صفاتِ خداوندی منعکس کرتے ہیں۔ ان کے اندر صفاتِ خداوندی کی نمود سے سکون و طمانیت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کے یہ خصائص تورات میں بھی مذکور تھے اور انجیل میں بھی۔

انھوں نے جس طرح بتدریج اس نظامِ خداوندی کو قائم کیا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو جیسے عمدہ بیج سے شگوفہ نکلتا ہے تو پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے پھر وہ مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے پھر جب اس کے خوشوں میں دانے پڑنے کا وقت آتا ہے تو وہ خود اپنی نالوں پر محکم اور استوار طریق سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ کاشتکار جب اپنی محنت کو یوں ثمربار ہوتے دیکھتا ہے تو وجد مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ لیکن یہی چیز اس کے دشمنوں کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے کا موجب بن جاتی ہے۔

اس طرح اللہ ہر اس جماعت کو جو اس کے نظام کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھ کر، صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو، اس کا وعدہ دیتا ہے کہ ان کی کوششوں کا ننھا سا بیج تمام خطرات سے محفوظ رہے گا۔ اور ان کی کھیتی بہترین ثمرات کی حامل ہوگی۔

یہ تھی وہ جماعت، جس نے رسول اللہ کے مقدس ہاتھوں میں تربیت پائی تھی اور جس نے حضورؐ کے بعد قرآنی نظام کو آگے چلانا تھا۔ اس مقصد کے لئے ان سے کہدیا گیا تھا کہ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲:۳۸) وہ اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کریں۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ

(۱) قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ عزت و تکریم کا معیار ذاتی جوہر اور حسنِ عمل ہے۔ نہ کہ حسب و نسب اور رشتہ داری کے تعلقات۔

(۲) صحابہ کبارؓ پکے اور سچے مومن تھے۔ ان کی سیرت بہت بلند اور کردار بڑا پاکیزہ تھا۔ ان کے دلوں میں

ایک دوسرے کی محبت پیوست تھی۔

(۳) قرآنی نظام کو قائم رکھنا اور آگے چلانا امت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اس کے لئے وہ باہمی مشورہ سے اپنے میں سے بہترین فرد کو (جو معیارِ خداوندی پر پورا اترے) منتخب کرکے، رسولؐ کا جانشین بنائیں گے۔ اسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہتے ہیں۔

امت کے لئے قرآن کے ان اصولوں پر عمل کرنے کا پہلا موقعہ، رسول اللہؐ کی وفات کے فوری بعد پیدا ہو گیا۔ یعنی خلیفہ کا انتخاب۔

یہ تھی قرآن کی تعلیم اور قرآن کی رُو سے صحابہ کبارؓ (جماعتِ انصار و مہاجرین) کی خصوصیاتِ کبریٰ۔ اب دیکھئے کہ تاریخ اس باب میں کیا بتاتی ہے؟

خلافت کے متعلق حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے خیالات

بخاری (باب وفات النبیؐ) میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت سے حسب ذیل واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

اس بیماری میں جس میں آپؐ نے وفات فرمائی۔ علی ابن ابی طالبؓ رسول اللہ صلعم کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا۔ ابو الحسن! رسول اللہ صلعم نے کس حالت میں صبح فرمائی۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمدللہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہے۔ تو عباس بن عبدالمطلبؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے اور ان سے کہنے لگے۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے بخدا میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلعم کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا۔ میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبدالمطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں۔ چلو رسول اللہ صلعم کے پاس چلیں اور آپؐ سے دریافت کر لیں کہ آپؐ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہو گی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور اگر ہمارے سوا دوسروں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائیگا (اور آپؐ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرما دیں گے (اس پر[1]) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہو سکتی ہے؟ عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہو گا)۔

اس پر علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو آپؐ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ صلعم سے

---

[1] بین القوسین عبارت بخاری میں نہیں ہے مگر علامہ عینی نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

ہرگز نہیں پوچھوں گا۔" (صحیح بخاری۔ باب وفات النبیؐ)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ ابھی حضورؐ کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور چچازاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ مطمئن تھے کہ خلافت کسی اور کے پاس نہیں جائے گی۔ لیکن حضرت عباسؓ کا اندازہ کچھ اور تھا۔ اس لئے وہ اس بارے میں نبی اکرمؐ سے (خلافت حضرت علیؓ کے متعلق) توثیق کرا لینا چاہتے تھے۔ اس پر حضرت علیؓ نے جو جواب دیا ہے وہ قابل غور ہے۔ یعنی اگر ہم نے رسول اللہؐ سے دریافت کر لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو پھر ہمارے لئے کوئی گنجائش (CHANCE) نہیں رہے گا۔

شیعہ حضرات کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح نبوت خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے اس میں انتخاب اور مشورہ کا کوئی سوال نہیں، اسی طرح خلافت بھی خدا کی طرف سے موہبت ہے۔ اس میں انتخاب وغیرہ کا کوئی سوال نہیں۔ امام خدا کی طرف سے منصوص اور مامور ہوتا ہے۔ یہ امامت حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد میں، خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہے۔

لیکن سنی حضرات کا یہ عقیدہ نہیں۔ ان کے نزدیک خلیفہ امت کے مشورہ سے منتخب ہوتا ہے۔ نہ ہی خلافت کوئی جائداد ہے۔ جو متوفی کے بعد اس کے رشتہ داروں کو بطور ترکہ مل سکتی ہے۔ یہ تصور کہ حکومت باپ کے بعد بیٹے کو ورثہ میں ملتی ہے ملوکیت ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔

اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو.....

جو روایت اوپر درج کی گئی ہے وہ شیعہ حضرات کی نہیں، سنیوں کی حدیث کی سب سے معتبر کتاب بخاری میں درج ہے۔ اب آپ غور فرمائیے کہ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو رسول اللہؐ کے قریب ترین صحابہ (حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ) کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟ یہ تصور کہ وہ (معاذ اللہ) اسلام کے ابتدائی اور بنیادی اصول کو بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ خلافت بطور وراثت یا استحقاق نہیں ملتی۔ یہ معاملہ امت کے باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے۔ پھر جو جواب حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اُس سے ان کی سیرت و کردار پر جو زد پڑتی ہے وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

اب آگے بڑھیئے۔ نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ چونکہ خلافت (جانشینیٔ رسول) کا معاملہ امت کے باہمی مشورہ سے طے ہونا تھا۔ اس لئے حضورؐ نے اس کے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی تاکہ امت کی آزادیٔ رائے پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو جائے۔ چونکہ یہ معاملہ بہت اہم تھا ــــ مرکزِ ملت کے بغیر دین کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ــــ اس لئے امت نے تجہیز و تکفین سے بھی پہلے اسے طے کر لینا

سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع

ضروری سمجھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہوا۔ جس میں حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق وہاں یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے۔ اُس وقت مہاجرین (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ) بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس اجتماع کی جو روئداد تاریخ میں بیان ہوئی ہے وہ قابلِ غور ہے۔ کہا گیا ہے کہ (انصار میں سے) حضرت حباب بن منذرؓ نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

حضرت حبابؓ کی تقریر

"اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو کیونکہ لوگ تمہارے مطیع رہیں۔ کسی شخص میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے تم اہل عزت و ثروت ہو۔ تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ تم بہادر اور دلیر ہو۔ لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے"

(محمد حسین ہیکل کی کتاب "ابوبکر صدیق اکبرؓ" ص ۱۰۰)

آپ نے غور فرمایا۔ ہماری تاریخ کا یہ بیان اُن انصار (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے متعلق ہے جن کے مہاجرین کے ساتھ فدائیانہ تعلقات اور بے لوث ایثار کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ (تاریخ کے بیان کے مطابق) اُن کی طرف سے اِن جذبات کا اظہار اُس وقت ہو رہا ہے۔ جب نبی اکرمؐ کی نعش مبارک بھی ہنوز آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ تو رہا انصار کے متعلق۔ اب مہاجرین کی بات سنئے۔ (تاریخ بتاتی ہے کہ) اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

حضرت عمرؓ کی تقریر

ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم! عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہونگے جب کہ رسول اللہ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جن میں رسول اللہ مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائل ظاہرہ اور براہین قاطعہ ہوں گے۔ رسول اللہ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے۔ جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہلِ عشیرہ ہیں۔ اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو باطل کا پیروکار، گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لئے تیار ہو۔

(ابوبکر صدیق از ہیکل ص ۱۰۰)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے انصار سے کہا۔

اے انصار! تم ہمیشہ سے کام نواور عمرؓ اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو۔ اگر تم نے اس وقت گڑبڑی دکھائی تو یہ سلطنت میں سے تمہارا حصہ غصب کرلیں گے۔ اگر یہ تمہاری مخالفت کریں تو انھیں یہاں سے جلا وطن کردو اور سلطنت پر خود قابض ہو جاؤ۔ کیونکہ اللہ کی قسم! تمہیں اس کے سب سے زیادہ حق دار ہو۔ تمہاری ہی تلواروں کی بدولت اسلام کو شان و شوکت نصیب ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی قدر و منزلت کا موجب تمہیں ہو۔ تمہیں اسلام کو پناہ دینے والے اور اس کی پشت پناہ ہو۔ اور اگر تم چاہو تو اسے اس کی شان و شوکت سے محروم بھی کر سکتے ہو۔ (ایضاً ص ۱۰۹-۱۰۸)

انداز گفتگو؟

حضرت عمرؓ نے یہ فقرہ سنا تو کہا

اگر تم نے اس قسم کی کوشش کی تو اللہ تمہیں ہلاک کر ڈالے گا۔ (ایضاً ص ۱۰۹)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے کہا۔

ہمیں نہیں اللہ تمہیں ہلاک کرے گا (ایضاً ص ۱۰۹)

یہ ہے ہماری تاریخ کے مطابق ان صحابہ کے باہمی تعلقات کا نقشہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ سارٹیفکیٹ دیتا ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ وہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور آپس میں بڑے ہمدرد تھے۔ وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ (۸/۶۳) ان کے دلوں میں خدا نے باہمی محبت اور الفت ڈال دی۔ وہ محبت اور الفت جو دنیا بھر کی دولت دے کر بھی خریدی نہیں جا سکتی تھی (۸/۶۳)۔ اُن صحابہؓ کے باہمی تعلقات اور اخلاق کے متعلق ہماری تاریخ یہ نقشہ پیش کرتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی جو تقریر (تاریخ کے بیان کے مطابق) اوپر درج کی گئی ہے اس میں انھوں نے اپنے (یعنی مہاجرین کے) حق خلافت کے متعلق یہ دلیل دی ہے کہ

رسول اللہ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں ہم سے کون جھگڑ سکتا ہے۔ جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہل عشیرہ (اہل خاندان) ہیں۔

یہ دلیل قابل غور ہے اس سے پیشتر ہم دیکھ چکے ہیں کہ تاریخ ہمیں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ ان کے نزدیک خلافت حضورؐ کے قرابت داروں کو ورثہ میں ملنی چاہیئے تھی۔ اب حضرت عمرؓ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے بھی استحقاقِ خلافت کے لئے یہی دلیل دی کہ ہم رسول اللہ کے اہل خاندان ہیں۔ غور کیجئے کہ اس سے ہماری تاریخ ہمیں کہاں لے جانا چاہتی ہے۔

لیکن تاریخ یہیں تک نہیں رہتی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتی ہے اور بتاتی ہے کہ جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تو حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور آپ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے۔ رسول اللہ نے فیصلہ

الائمۃ من قریش کردیا ہوا ہے کہ الائمۃ من قریش خلافت قریش میں رہے گی۔ اس پر انصار خاموش ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔

یہ حدیث متفق علیہ طور پر صحیح مانی جاتی ہے۔ لیکن آپ ذرا اس کی گہرائی میں جائیے اور سوچئے کہ یہ کبھی رسول اللہ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟ قرآن مسلسل و متواتر نسل اور خون کے امتیازات مٹا کر مساوات انسانیہ اور تکریم آدمیت کی تعلیم دیتا رہا۔ حضورؐ کی ساری زندگی اس بلند و برتر تعلیم کا عملی نمونہ رہی۔ آپ اس امر کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ اس تعلیم کا حامل رسولؐ یہ فیصلہ کرے گا کہ حکومت میرے قبیلہ کے اندر رہے گی۔ یہ ایک روایت قرآن کی بنیادی تعلیم اور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو باطل قرار دے دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ہماری تاریخ اس روایت کو رسول اللہ کی طرف منسوب کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار اور مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حق خلافت کے لئے بطور دلیل پیش کیا اور اسے سب نے تسلیم کر لیا۔ یعنی ہماری تاریخ ایک ہی واقعہ میں، خدا کے رسولؐ اور رسول کے صحابہ کبارؓ کے متعلق نسل پرستی کا ایسا تصور پیدا کر جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔

رسول اللہ کی وفات کے فوری بعد صحابہ کبارؓ (انصار و مہاجرین) کا جو پہلا اجتماع ہوا، اس میں ہماری تاریخ کے مطابق) ان حضرات کے باہمی تعلقات، انداز گفتگو اور اسلوب دلائل کا نقشہ ہمارے سامنے آگیا۔ اب اس سے آگے بڑھیئے۔ (امام) طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

دست و گریباں سابقہ روایت کے سلسلہ سے عبداللہ بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ جب ہر طرف سے لوگ آ آ کر ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے قریب تھا کہ وہ سعدؓ کو روند ڈالتے۔ اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ ان کو نہ روند دو۔ عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کرے اس کو قتل کر دو اور خود ان کے سرہانے آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی عمرؓ نے کہا چھوڑ دو اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت نہ رہیگا۔ ابوبکرؓ نے کہا عمرؓ خاموش رہو اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سود مند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ سعدؓ نے کہا اگر مجھ میں اٹھنے کی بھی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کی گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بات نہیں مانتے بلکہ میں ان کی اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھا لے چلو۔ ان کے آدمیوں نے ان کو اٹھا کر اُن کے گھر میں پہنچا دیا۔ چند روز ان سے تعارض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے تم بھی آ کر بیعت کر لو۔ سعدؓ نے کہا یہ نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش خالی نہ کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے

خون سے رنگین نہ کر لوں اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے وار نہ کر لوں اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے لڑ نہ لوں، ہرگز بیعت نہ کروں گا۔ خدا کی قسم، اگر انسانوں کے ساتھ جن بھی تمہارے ساتھ ہو جائیں تب بھی جب تک کہ میں اپنے معاملے کو اپنے رب کے سامنے پیش نہ کر لوں بیعت نہیں کروں گا۔

(تاریخ طبری۔ جلد اول۔ حصہ چہارم۔ اردو ترجمہ۔ شائع کردہ۔ جامعہ عثمانیہ ص۸)

معاذ اللہ! اس سے ایک صفحہ آگے ہے۔

ضحاک بن خلیفہ سے مروی ہے کہ امارت کے انتخاب کے موقع پر حباب بن المنذرؓ نے کھڑے ہو کر تلوار نکال لی اور کہا کہ میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں۔ میں شیر ہوں اور شیر کی کھوہ میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں۔ عمرؓ نے اس پر حملہ کیا اس کے ہاتھ پر وار کیا۔ تلوار گر پڑی، عمرؓ نے اسے اٹھا لیا اور پھر سعدؓ پر جھپٹے اور لوگ بھی سعدؓ پر جھپٹے۔ اب سب نے باری باری آکر بیعت کی۔ سعدؓ نے بھی بیعت کی۔ اس وقت عہد جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تو تو میں میں ہونے لگی۔ ابوبکرؓ اس سے دور رہے جس وقت سعدؓ پر لوگ چڑھ گئے۔ کسی نے کہا کہ تم لوگوں نے سعدؓ کو مار ڈالا۔ عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کرے۔ وہ منافق ہے۔ عمرؓ کی تلوار کے سامنے ایک پتھر آگیا اور ان کی ضرب سے وہ قطع ہو گیا۔

کلیجے پر ہاتھ رکھیے اور اس فقرہ کو پھر پڑھیے۔

اس وقت عہد جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تو تو میں میں ہونے لگی۔

بہرحال، حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد دوسرے امیدوار حضرت سعدؓ کا کیا طرزِ عمل رہا؟ سنئے

اس کے بعد سعدؓ نہ ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ حج میں بھی مناسک ان کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے۔ ابوبکرؓ کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی۔

(طبری۔ ص۸)

داڑھیاں نوچنا! ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ سقیفہ کے تنازعے میں، حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی تھی۔ تاریخ طبری ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچنا (معاذ اللہ) ان حضرات کا معمول سا ہو گیا تھا چنانچہ اسی کتاب میں (جس کے اقتباسات اوپر دیئے گئے ہیں) لکھا ہے کہ

جب حضرت اسامہؓ کی امارتِ عساکر کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ میں اختلاف رائے ہوا تو ابوبکرؓ جو بیٹھے ہوئے تھے غصے سے اچھل پڑے اور بڑھ کر انہوں نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی اور کہا۔ اے ابن الخطاب! اللہ تیری ماں کا برا کرے کہ تم مر جاتے۔ بھلا جس شخص کو رسول اللہ نے اس پر فائز کیا ہے۔ تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اسے علیحدہ کر دوں۔ (ایضاً ص۱۲)

یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب پھر انتخاب خلیفہ اول کی تاریخی داستان کی طرف آیئے۔ اس تمام واقعہ میں حضرت علیؓ کا ابھی تک کہیں ذکر نہیں آیا۔ آپ یقیناً یہ معلوم کرنے کے لئے مشوش ہوں گے کہ جن بزرگوار (یعنی حضرت علیؓ) کے دل میں سب سے پہلے خلافت کا خیال پیدا ہوا تھا حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب پر ان کی طرف سے کیا ردعمل ہوا۔ تاریخ اس کے متعلق تفصیل سے بتاتی ہے۔ سنئے۔ محمد حسین ہیکل (مصری) اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

حضرت علیؓ کا ردعمل

مہاجرین اور انصار کے چند افراد حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں شامل نہ تھے بلکہ ان کا میلان حضرت علیؓ بن ابی طالب کی طرف تھا۔ ان میں سے مشہور لوگ یہ تھے۔ عباسؓ بن عبدالمطلب، فضل بن عباسؓ زبیرؓ بن عوام بن العاص، خالدؓ بن سعید، مقدادؓ بن عمرو، سلمان فارسیؓ، ابوذر غفاریؓ، عمار بن یاسرؓ، براء بن عازبؓ ابی بن کعبؓ۔ ابوبکرؓ نے عمرؓ، ابوعبیدہؓ بن جراح، مغیرہ بن شعبہؓ سے ان لوگوں کے بارے میں مشورہ کیا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ عباسؓ بن عبدالمطلب سے ملئے اور خلافت میں ان کا حصہ بھی رکھ دیجئے جو ان کی اولاد کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس طرح ان کے اور ان کے بھتیجے علیؓ بن ابی طالب کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے گا اور یہ بات آپ کو علیؓ کے مقابلہ میں فائدہ مند ثابت ہوگی۔

اس مشورے کے مطابق ابوبکرؓ عباسؓ سے ملے تو دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ "آپ رسول اللہ کے چچا ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خلافت میں آپ کا حصہ بھی موجود ہو۔ جو آپ کے بعد آپ کی اولاد میں منتقل ہوتا رہے۔" لیکن عباسؓ نے یہ پیشکش رد کر دی کہ اگر خلافت ہمارا حق ہے تو ہم ادھوری خلافت لینے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ (ابوبکر ص ۱۱۹)

اس کے بعد ہیکل لکھتا ہے۔

ایک اور روایت میں جسے یعقوبی اور بعض دیگر مورخین نے بھی ذکر کیا ہے مذکور ہے کہ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت حضرت علیؓ کی بیعت کرنے کے ارادے سے حضرت فاطمہؓ الزہرا بنت رسول اللہ کے گھر میں جمع ہوئی۔ ان میں خالد بن سعیدؓ بھی تھے خالد نے حضرت علیؓ سے کہا

"اللہ کی قسم! رسول اللہ کی جانشینی کے لئے آپ سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں۔ اس لئے آپ ہماری بیعت قبول کیجئے۔"

جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ چند لوگوں کو لے کر حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے اور اس پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ تلوار ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلے۔ سب سے پہلے ان کی مڈبھیڑ حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تلوار توڑ ڈالی اور وہ دوسرے لوگوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گئے۔ اس پر حضرت فاطمہؓ گھر سے باہر آئیں اور کہا۔

"یا تو تم میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ اللہ کی قسم میں اپنے سر کے بال نوچ لوں گی۔ اور تمہارے خلاف اللہ سے مدد طلب کروں گی۔" حضرت فاطمہؓ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سب لوگ گھر سے باہر نکل گئے۔

کچھ روز تک تو مذکورہ بالا اصحاب بیعت سے انکار کرتے رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے سب نے بیعت کر لی۔ سوا حضرت علیؓ کے جنہوں نے چھ سات مہینے تک بیعت نہ کی۔ مگر حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد انھوں نے بھی بیعت کر لی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے چالیس روز بعد بیعت کر لی تھی۔ ایک اور روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر بنی ہاشم حضرت فاطمہؓ کے گھر میں خفیہ مجالس منعقد کرنے سے باز نہ آئے تو وہ ایندھن جمع کر کے گھر کو آگ لگا دیں گے۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۰)

اس وقت تک جو کچھ سامنے آیا ہے۔ اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت علیؓ نے اپنے موقف کی تائید میں دلیل کیا پیش کی تھی۔ اب وہ دلیل سنئے۔ ہیکل لکھتا ہے۔

حضرت علیؓ کی دلیل

حضرت علیؓ اور دیگر بنی ہاشم کے بیعت نہ کرنے سے متعلق مشہور ترین روایت وہ ہے جو ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" میں درج کی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے بعد حضرت عمرؓ چند لوگوں کو ساتھ لے کر بنی ہاشم کے پاس گئے جو اس وقت حضرت علیؓ کے گھر جمع تھے۔ تاکہ ان سے بھی بیعت کا مطالبہ کریں۔ لیکن سب لوگوں نے حضرت عمرؓ کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ زبیرؓ بن العوام تو تلوار ہاتھ میں لے کر حضرت عمرؓ کے مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"زبیرؓ کو پکڑو"

لوگوں نے زبیر کو پکڑ کر تلوار ان کے ہاتھ سے چھین لی۔ اس پر مجبوراً زبیر نے جا کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔

حضرت علیؓ سے بھی بیعت کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور کہا۔ میں تمہاری بیعت نہ کروں گا کیونکہ میں تم سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں اور تمہیں میری بیعت کرنی چاہیئے تھی۔ تم نے یہ کہہ کر انصار کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم رسول اللہ کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے قریبی عزیز ہی خلافت کے حقدار ہیں۔ اس اصول کے مطابق تمہیں چاہیئے تھا کہ خلافت ہمارے حوالے کرتے مگر تم نے اہل بیت سے چھین کر خلافت غصب کر لی۔ کیا تم نے انصار کے سامنے یہ دلیل پیش نہ کی تھی کہ ہم خلافت کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ رسول اللہ ہم میں سے تھے۔ اس لئے تم ہماری اطاعت قبول کرو اور خلافت ہمارے حوالے کرو؟ وہی دلیل جو تم نے انصار کے مقابلے میں پیش کی تھی اب میں تمہارے مقابلے میں پیش کرتا ہوں۔ ہم تم سے زیادہ رسول اللہ کے قریبی

عزیز ہیں۔ اس لئے خلافت ہمارا حق ہے۔ اگر تم میں ذرہ برابر ایمان ہے تو ہم سے انصاف کرکے خلافت ہمارے حوالے کرو۔ لیکن اگر تمہیں ظالم بننا پسند ہے تو جو تمہارا جی چاہے کرو تمہیں اختیار ہے۔

(ایضاً صـ۱۳۲)

آپ نے غور فرمایا کہ تاریخ نے جو دلیل حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی طرف منسوب کی تھی (کہ خلافت قریش میں رہے گی اور ہم رسول اللہ کے اہل خاندان ہیں) اسے (تاریخ نے) کس سادگی سے حضرت علیؓ کی طرف لوٹایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دلیل کے بعد سنی حضرات کا موقف اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ ان سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں بن پڑ سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ (تاریخ نے) یہ دلیل اولاً حضرات شیخینؓ کی طرف کیوں منسوب کی تھی!

بہرحال حضرت علیؓ کے اس جواب پر حضرت عمرؓ نے کہا

میں اس وقت تک آپ کو نہ چھوڑوں گا جب تک آپ بیعت نہ کریں گے۔ (ایضاً صـ۱۳۳)

سرگرمیاں

اس کے بعد

حضرت علیؓ اس وقت تیزی میں آگئے اور کہنے لگے۔ "عمرؓ تم شوق سے دودھ دوہو جس میں تمہارا بھی حصہ ہے آج تم اس لئے خلافت ابوبکر کی حمایت کر رہے ہو کہ کل کو خلافت تمہارے پاس لوٹ آئیگی لیکن میں کبھی ان کی بیعت نہ کروں گا۔"

حضرت ابوبکرؓ کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے اور درشت کلامی تک نوبت نہ آجائے انہوں نے کہا۔ "علیؓ! اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں بھی تمہیں مجبور نہیں کرتا۔"

اس پر ابوعبیدہ بن جراح حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی سے کہا۔ "بھتیجے! تم ابھی کم عمر ہو اور یہ لوگ بزرگ ہیں۔ نہ تمہیں ان جیسا تجربہ حاصل ہے اور نہ تم ان کی طرح جہاندیدہ ہو۔ اگر قوم میں کوئی شخص رسول اللہ کی جانشینی کے فرائض صحیح طور پر بجا لا سکتا اور خلافت کا بوجھ کما حقہٗ اٹھا سکتا ہے تو وہ صرف ابوبکرؓ ہیں اس لئے تم ان کی خلافت قبول کر لو۔ اگر تم نے لمبی عمر پائی تو یقیناً اپنے علم و فضل، دینی سبقت فہم و ذکاء، سابقیت اسلام، حسب و نسب اور رسول اللہ کی دامادی کا شرف حاصل ہونے کے باعث تمہیں خلافت کے مستحق ٹھہرو گے۔"

یہ سنکر حضرت علیؓ کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ غصے سے بولے۔ "اللہ اللہ اے گروہ مہاجرین! تم رسول اللہ کی حکومت کو آپ کے گھر سے نکال کر اپنے گھروں میں داخل نہ کرو۔ آپ کے اہل بیت کو ان کے صحیح مقام پر سرفراز کرو اور ان کا حق انہیں دو۔ اے مہاجرین! اللہ کی قسم! ہمیں خلافت اور حکومت کے مستحق ہیں

کیونکہ ہم اہل بیت ہیں۔ ہم اس وقت تک اس کے حقدار ہیں جب تک ہم میں اللہ کی کتاب کا قاری، دین کا فقیہہ، رسول اللہ کی سنت کا عالم، رعایا کی ضرورت سے واقف، ان کی تکالیف کو دور کرنے والا اور ان سے مساوات کا سلوک کرنے والا قائم ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ہم میں ان صفات کا حامل موجود ہے۔ اس لئے اپنی خواہشات کی پیروی کر کے اللہ کے راستے سے گمراہی اختیار نہ کرو۔ اور حق کے راستے سے دور نہ چلے جاؤ۔" راویوں کے بیان کے مطابق بشیر بن سعدؓ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ جب انھوں نے حضرت علیؓ کی باتیں سنیں تو کہا۔ "اے علیؓ! اگر یہ باتیں جو اس وقت تم نے کہی ہیں انصار کا گروہ ابوبکرؓ کی بیعت سے پہلے سن لیتا تو وہ لوگ تمہارے سوا کسی کی بیعت نہ کرتے۔"

اس گفتگو کے بعد حضرت علیؓ طیش میں بھرے ہوئے گھر چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو وہ حضرت فاطمہؓ کو لے کر باہر آئے اور انھیں ایک خچر پر بٹھا کر انصار کے پاس لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ گھر گھر جاتیں اور ان سے حضرت علیؓ کی مدد کرنے کی درخواست کرتیں۔ لیکن ہر جگہ سے انھیں یہی جواب ملتا۔

"اے بنت رسول اللہ! ہم ابوبکرؓ کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے خاوند بیعت سے قبل ہمارے پاس آتے تو ہم ضرور ان کی بیعت کر لیتے۔"

یہ سنکر حضرت علیؓ غصہ میں آکر جواب دیتے۔ "کیا میں رسول اللہ کی نعش کو بلا تجہیز و تکفین چھوڑ دیتا اور باہر نکل کر آپ کی جانشینی کے متعلق لڑتا جھگڑتا پھرتا؟"

حضرت فاطمہؓ بھی کہتیں۔ "ابو الحسن (علیؓ) نے وہی کیا جو ان کے لئے مناسب تھا۔ باقی ان لوگوں نے جو کچھ کیا اللہ ان سے ضرور اس کا حساب لے گا اور باز پرس کرے گا۔" (ایضاً ص ۲۵-۱۲۲)

ہیکل نے ان واقعات کو مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔ اس باب میں بخاری میں حسب ذیل روایت آئی ہے۔

بخاری کی حدیث

"حضرت فاطمہؓ نبی صلعم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے شوہر علیؓ نے رات کو ان کو دفن کر دیا اور ان کے انتقال کی ابوبکرؓ کو اطلاع نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی۔ اور جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار رہا۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں تو اب انھوں نے حضرت ابوبکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کرنے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انھوں نے بیعت[1]

---

[1] بعینہٖ اسی سند کے ساتھ ابن جریر طبری نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ انھوں نے اسکے ساتھ اتنا اضافہ کیا ہے۔ معمر کہتے ہیں کہ کسی نے ابن شہاب زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تو زہری نے جواب دیا کہ نہیں نہ حضرت علیؓ نے بیعت کی اور نہ بنو ہاشم میں سے کسی اور نے بیعت کی۔ جب تک چھ ماہ بعد حضرت علیؓ نے بیعت کر لی تو بنو ہاشم نے بھی بیعت کر لی۔"

نہیں کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ابوبکرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیے۔ مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے۔ حضرت علیؓ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "نہیں خدا کی قسم آپ ان کے ہاں تنہا نہیں جا سکیں گے۔ اس پر حضرت صدیقؓ نے کہا تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ میرا کیا کر لیں گے۔ خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا "ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا ہے اسے پہچانتے ہیں اور کسی بھلائی پر جو حق تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہم حسد نہیں کرتے لیکن تم نے امر خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلعم سے ہماری قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ ہے[2]۔

ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ابوبکر صدیقؓ منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا، اور بیعت سے علیؓ کے تخلف کی صورت کو بیان کیا اور جو عذر انھوں نے بیان کیا تھا اسے پیش کیا پھر مغفرت کی دعا مانگی اور (اس کے بعد) حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکرؓ کے حق عظمت کو بیان کیا اور کہا کہ اب تک انھوں نے جو کچھ کیا ہے وہ ابوبکرؓ سے کسی حسد کی بنا پر نہیں کیا اور نہ اس فضیلت سے انکار کی بنا پر جو خدا نے انھیں دی ہے بلکہ ہم سمجھتے تھے کہ امر خلافت میں ہمارا حصہ ہے اور ابوبکرؓ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ لہٰذا ہم اپنے دلوں میں ناراض تھے۔ (صحیح بخاری، کتاب المغازی)

بخاری کی اس روایت میں چند باتیں بڑی غور طلب ہیں۔ مثلاً

(۱) حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ سے اس قدر ناراض تھے کہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کی اطلاع تک نہیں دی۔ اور چپکے ہی چپکے انھیں رات کو دفن کر دیا۔

(۲) جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں، حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہ کی لیکن ان کی وفات کے فوری بعد انھوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کی نظروں میں ان کا پہلا سا وقار باقی نہیں رہا۔ اس لئے انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی جائے۔

(۳) حضرت علیؓ نے اپنے حق خلافت کے لئے یہ دلیل دی کہ وہ رسول اللہ کے قرابت دار ہیں۔

آپ غور کیجئے کہ تاریخ کے اس بیان کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے حضرت علیؓ کے متعلق کیا

---

[1] ابن جریر کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے اس موقع پر تمام بنو ہاشم کو اپنے ہاں جمع کر لیا تھا۔ (ایضاً)

[2] ابن جریر طبری نے یہاں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ولکنا کنا نری ان لنا فی ھذا الامر حقا فاستبددتم بہ علینا یعنی ہم یہ سمجھتے تھے کہ امر خلافت ہمارا حق ہے اور تم نے ہمارے (ایضاً)

تصور قائم ہوتا ہے؟

صحابہؓ کا ارتداد؟

تاریخ کے اس بیان کے مطابق حضرت علیؓ نے یہ بھی کہا کہ جن لوگوں نے انھیں خلافت سے محروم رکھا ہے انھوں نے غصب اور استبداد سے کام لیا ہے۔ یہی وہ "جرم" ہے جس کی بنا پر شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد، بجز چند اصحاب (جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی) باقی سب (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔ اس کے متعلق سُنی حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ عقیدہ تعصب پر مبنی ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب کہ خود ان کی (حدیث کی) معتبر ترین کتاب، بخاری میں حسب ذیل روایت موجود ہے۔

> حضرت ابن عباسؓ آنحضرتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا، برہنہ بدن، بغیر ختنہ کے حشر کیے جاؤ گے۔ آپؐ نے یہ آیت پڑھی كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیمؑ ہیں۔ الخ اس دن میرے چند صحابہؓ بائیں جانب (یعنی جہنم کی طرف) لے جائے ہوں گے۔ میں کہوں گا یہ تو میرے صحابہؓ ہیں۔ پھر اللہ فرمائے گا یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے[1] جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے۔ پس میں کہوں گا جیسا کہ نیک بندے (یعنی عیسیٰؑ) نے کہا تھا وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ (۵/۱۱۷)
>
> (بخاری کتاب الانبیاء، ترجمہ شائع کردہ نور محمد تاجر کتب، کراچی۔ جلد دوم صفحہ ۱۴۹)

سوچئے کہ بخاری کی اس حدیث کی رُو سے بات کہاں سے کہاں پہونچ جاتی ہے؟ یہ وہ صحابہؓ ہیں جن کے متعلق قرآن شہادت دیتا ہے کہ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا (۸/۴)۔ "یہی لوگ ہیں جو حقیقی مومن ہیں"۔ اگر ان مومنین کے ایمان کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اُدھر رسول اللہ نے آنکھیں بند کیں اِدھر یہ (معاذ اللہ) ایمان سے پھر گئے، تو یہ دیگراں چہ رسد؟ اور اگر کوئی معترض یہ کہدے (اور کہنے والے کہتے ہی ہیں) کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"۔ تو سوچئے کہ (ان روایات کی رو سے) خود نبی اکرمؐ کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور سامنے آتا ہے؟

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ جس تاریخ کی یہ کیفیت ہے اُسے مسترد کیوں نہ کر دیا جائے؟ ایسا کرنے میں کون سا امر مانع ہے؟ یہ بات بڑی معقول ہے اور ایسا کرنے میں کوئی دِقت نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن

---

[1] بخاری کے اصلی الفاظ "مرتدین علیٰ اعقابھم" ہیں۔

تاریخ دین بن چکی ہے

مشکل یہ ہے کہ ہماری تاریخ کو تاریخ کے مقام سے اٹھا کر دین بنا لیا گیا ہے ان احادیث کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے، رسول اللہ کو بذریعہ وحی خفی ملی تھیں۔ اس لئے یہ قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل ہیں (مثلہٗ معہ) اتنا ہی نہیں۔ ان کے متعلق یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو قرآن کو منسوخ سمجھو اور حدیث کو برقرار رکھو۔ کراچی کے ادارۂ "تحقیقِ حق" کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا ہے جس کا نام ہے "فتنۂ انکارِ حدیث"۔ اس کے مصنف ہیں "علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی"۔ وہ اس پمفلٹ میں لکھتے ہیں ــــــ

اگر کوئی کہے کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ کے کیا معنی ہیں۔ نبی سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تو کتاب اللہ کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "ما انزل اللہ" کے معنی صرف کتاب اللہ نہیں ہے۔ بلکہ "ما انزل اللہ" کتاب اللہ بھی ہے اور حدیث رسول اللہ بھی۔ (صـ۵۲)

حدیث قرآن کو منسوخ کر دیتی ہے

اس کے بعد لکھتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ قولِ رسول قرآن کے خلاف ہو تو وہ بھی حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرَنِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ ..... تمہارے اوپر والدین کی وصیت فرض ہے اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے۔ رسول اللہ نے فرمایا لا وصیۃ للوارث وارث کے لئے وصیت نہیں اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسول قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا۔ (صـ۸۵)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

اب اگر کہا جائے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسول کا قول قرآن کو نسخ کر دے! تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ رسول کا قول اس کا اپنا قول نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے۔ جس طرح قرآن خدا کا قول ہے۔ اسی طرح رسول کا قول بھی خدا کا قول ہے اور جس طرح قرآن کی ایک آیت قرآن کی دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے۔ اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قولِ رسول) دوسرے قول (یعنی قرآن) کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (صـ۸۶)

ہم نے یہ کہا تھا کہ ہمیں چاہیئے کہ ہم قرنِ اول (عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ) کی تاریخ[1] کے ذخیرہ کو قرآن کی

---

[1] جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، قرنِ اول کی تاریخ کا کچھ حصہ کتب احادیث میں ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

روشنی میں پرکھ لیں۔ جو باتیں قرآن کے مطابق ہوں انھیں صحیح تسلیم کرلیا جائے۔ جو اس کے خلاف جائیں انھیں مسترد کردیا جائے۔ اس کے جواب میں حافظ ایوب صاحب نے فرمایا۔

قرآن اور حدیث میں اختلاف ہوسکتا ہے

جس طرح خدا کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں کہ وہ عقل کے مطابق ہو' بالکل اسی طرح نبی کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ نبی کا قول بھی قول اللہ ہے اور قرآن بھی قول اللہ ہے اور اللہ کے دونوں قول ہیں۔ قرآن بھی اور حدیث رسول بھی۔ تو اللہ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں تنوع نہ ہو۔ جس طرح کہ اس کے ایک فعل کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسرے فعل کے مطابق ہو۔ ایک طرف پہاڑ کی چوٹی فلک تک پہونچ رہی ہے۔ دوسری طرف کھڈ کی گہرائی تحت الثریٰ تک پہونچ رہی ہے۔ جس طرح اس کے ایک فعل کا دوسرے فعل کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح اس کے ایک قول کا (یعنی حدیث رسول کا) اس کے دوسرے قول (یعنی قرآن) کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ (ص ۵۱)

ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے۔

يَكْثُرُ لَكُمُ الْاَحَادِيْثُ مِنْ بَعْدِيْ. فَاِذَا رُوِيَ عَنِّيْ حَدِيْثٌ فَاعْرِضُوْهُ عَلٰى كِتَابِ اللهِ. فَمَا وَافَقَ فَاقْبَلُوْهُ. وَمَا خَالَفَ فَرُدُّوْهُ.

(بحوالہ کتاب التوضیح والتلویح صفحہ ۳۴۸)

یعنی رسول اللہ نے فرمایا کہ میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی۔ سو جب کوئی حدیث میری طرف سے روایت کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو جو اس کے موافق ہو اسے قبول کرو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے رد کردو۔" اس حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ یہ قرآن کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ نبی اکرمؐ کا کوئی ارشادِ گرامی قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی طرف سے اس کا کیا جواب ملا؟ جماعت اہل حدیث کے ترجمان ماہنامہ "رحیق" نے اپنی اپریل ۱۹۵۸ء

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور کچھ حصہ کتب سیر و آثار میں۔ لیکن کتب احادیث کو قرآن کے ہم پایہ بلکہ قرآن کا ناسخ ماننے والوں پر یہ بات بھی گراں گذرتی ہے کہ حدیث کو تاریخ کہہ دیا جائے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ واقعہ خلافت اول کے متعلق بخاری کی جو احادیث سابقہ صفحات میں درج کی گئی ہیں وہ اگر تاریخی بیانات نہیں تو اور کیا ہیں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ خود امام بخاری نے اپنی اس کتاب (مجموعہ احادیث) کا نام "الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ و ایامہ" رکھا تھا (بحوالہ "تدوین حدیث" مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم) اس سے واضح ہے کہ خود امام بخاری کے نزدیک ان کی کتاب تاریخ کی کتاب تھی۔

کی اشاعت میں لکھا۔

حدیث کو قرآن کے مطابق ہونا چاہیئے یہ عقیدہ ملحدوں کا ہے۔

اس حدیث کو ملحدین نے وضع کیا تھا۔ اور انہی ملحدین کے خیالات کی خوشہ چینی بکو اس ازم کے یہ ممبران کر رہے ہیں۔ امام خطابیؒ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں وَضَعَهُ الزَّنَادِقَةُ الَّذِيْنَ مَقْصُوْدُهُمْ إِفْسَادُ الدِّيْنِ وَيَدْفَعُهُ قَوْلُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّيْ أُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ۔ (ظفر الامانی علی مختصر الجرجانی صفحہ ۲۶۷)

یعنی یہ روایت ان زندیقوں اور حدیث دشمنوں کی خود ساختہ حدیث ہے۔ جن کا مقصد احادیث کو رد کر دینے سے دینی نظام کا فاسد و باطل کر دینا ہے۔ اور اس حدیث کا بطلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے خود ہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہے کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور قرآن کے مانند بھی دیا گیا ہوں۔ پس "حدیث" ہی قرآن کے مانند ہے۔ کیونکہ دوسری روایت میں تشریح ہے کہ "قرآن کے مانند" کا نام "حدیث" ہے۔ وہ روایت یہ ہے لَا أُلْفِيَنَّ أَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى أَرِيْكَتِهٖ يَصِلُ إِلَيْهِ عَنِّيْ الْحَدِيْثُ فَيَقُوْلُ لَا نَجِدُ هٰذَا الْحُكْمَ فِي الْقُرْآنِ أَلَا وَإِنِّيْ أُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ (ظفر الامانی صفحہ ۲۶۸) دوسری حدیث کے یہ لفظ ہیں۔ يُوْشِكُ الرَّجُلُ مُتَّكِئًا عَلٰى أَرِيْكَتِهٖ يُحَدَّثُ بِحَدِيْثِيْ فَيَقُوْلُ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ الْحَدِيْثُ (دارمی صفحہ ۱۴۴ جلد اول طبع مصر) اسی قسم کی روایات الکفایہ (ص ۹-۱۰) میں خطیبؒ نے ذکر کی ہیں جن میں صاف تصریح ہے کہ حدیث کو رد نہ کرو۔ مجھے قرآن کی طرح اور اس کی مانند "حدیث" بھی دی گئی ہے۔ امام خطابیؒ کی طرح امام شافعیؒ، امام المحدثین عبدالرحمٰنؒ ابن مہدی وغیرہ نے بھی اس حدیث کو زندیقوں کا وضع کردہ لکھا ہے۔ امام بیہقیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ جو روایت سنت نبویہ کو قرآن پر پیش کرنے کی خاطر بنائی گئی ہے وہ باطل ہے۔ علامہ ہیثمیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی متروک منکر الحدیث ہے۔ (مجمع الزوائد جلد اول صفحہ ۱۷۰)

یعنی یہ مسلک کہ جو کچھ قرآن کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے غلط قرار دو، (ان حضرات کے نزدیک) ملحدین اور زنادقہ کا وضع کردہ ہے!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

گذشتہ اوراق میں جو اقتباسات آپ کی نظروں سے گذرے ہیں، ان سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آچکی ہے کہ ہماری کتب احادیث و سیر و آثار میں ایسی باتیں موجود ہیں جو

(۱) قرآن کریم کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف ہیں۔

(۲) جن سے نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر حرف آتا ہے۔

(۳) جن سے صحابہ کبارؓ کی سیرت و کردار مطعون ہو جاتے ہیں۔

(۴) جو علم و عقل کے بھی خلاف ہیں۔

یہ ہوا کیسے؟ اس کے بعد آپ کے دل میں لازماً یہ سوال ابھرے گا کہ

(ا) اس قسم کی باتیں ان کتابوں میں آ کیسے گئیں؟

(ب) ہزار برس سے یہ متواتر آگے منتقل کیسے ہوتی رہیں۔ یعنی لوگوں نے اس قسم کی باتوں کو ان کتابوں سے خارج کیوں نہ کر دیا؟ اور

(ج) آج بھی ہمارا قدامت پرست طبقہ ان باتوں کو صحیح ماننے اور صحیح منوانے پر اس قدر مُصر کیوں ہے؟

یہ سوالات ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو ذرا بھی عقل و بصیرت سے کام لے اور ان امور پر غور و فکر کرے۔ جہاں تک پہلی دو شقوں کا تعلق ہے (یعنی اس قسم کی باتیں ہمارے لٹریچر میں آ کیسے گئیں۔ اور قوم نے انہیں ان کتابوں سے خارج کیوں نہ کر دیا؟) اس کے متعلق تفصیلی بحث کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مناسب موقعہ وہ ہے جب ہم اپنی پوری تاریخ کا از سرِ نو جائزہ لیں اور اس کے ایک ایک گوشے کے متعلق ریسرچ کریں۔ ظاہر ہے کہ ایک مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ہم سر دست صرف اس نقطہ کو پیش کریں گے کہ آج بھی اس قسم کی باتوں کو صحیح ماننے اور صحیح منوانے پر اس قدر زور کیوں دیا جا رہا ہے؟ اس نقطہ کی وضاحت ایک واقعہ سے ہو جائے گی۔ اسے غور سے سنئے۔

کوئی دو برس اُدھر کی بات ہے کہ جماعت اسلامی کے ارباب بست و کشاد کا ایک حلقہ جماعت سے الگ ہو گیا۔ ان الگ ہونے والے حضرات نے اپنی علیحدگی کی وجوہات میں ایک بڑی وجہ یہ بتائی تھی کہ جماعت کے دعوتی اور اشاعتی دور میں جن اصولوں کو دین کی محکم اساس کے طور پر پیش کیا جاتا تھا نظام کے عملی قیام کے وقت ان سے انحراف کیا جا رہا ہے۔[1] ظاہر ہے کہ یہ اعتراض بڑا دقیع اور یہ جرم بڑا سنگین تھا۔ لیکن مودودی صاحب نے

---

[1] ان تفاصیل کے لئے ایسٹرن لائٹ لاہور بابت ۳۱ جنوری ۱۹۵۸ء اور طلوع اسلام بابت مارچ و جولائی ۱۹۵۸ء ملاحظہ فرمائیے۔

ایسا معاذ اللہ رسول اللہؐ نے بھی کیا تھا!

اس کے جواب میں کہا کہ میں نے یہ کون سا انوکھا کام کیا ہے (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ نے اسلام کے اشاعتی دور میں جو اصول بیان فرمائے تھے اس کے عملی قیام کے وقت اُن میں لچک پیدا کر لی تھی۔ مثلاً۔

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن

جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپؐ نے ہدایت دی کہ اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ امام قریش میں سے ہوں۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس وضعی روایت سے جو ہماری کتب تاریخ میں درج ہے (اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) مودودی صاحب نے کس طرح فائدہ اٹھایا؟ ظاہر ہے کہ اگر معاملہ صرف قرآن تک رہتا اور دین میں اسی کو سند مانا جاتا تو مودودی صاحب کو اپنی روش کی تائید میں کوئی دلیل و سند نہ مل سکتی۔ لیکن چونکہ تاریخ کو (قرآن کے برابر بلکہ اس سے بھی افضل) سند مان لیا گیا ہے اور اس میں ہر قسم کا رطب و یابس مسالہ موجود ہے۔ اس لئے اُس سے ہر شخص کو اس کے ہر فیصلے اور عمل کی سند مل سکتی ہے۔

جماعت سے الگ ہونے والوں نے اس کے جواب میں کہا۔

غور فرمایئے۔ اگر یہ طریق کار خدا کے آخری نبیؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ اور اگر اسلامی تحریک اس اسوۂ حسنہ کے مطابق اس طریق کار کو اپنا معمول بناتی ہے اور ہر کوئی ایسی جماعت جو اقامتِ دین کی علمبردار ہو وہ اس اصول کو بطور فلسفہ اور عقیدہ کے طے کر لیتی ہے کہ اسلامی نظام کے دعوتی اور اشاعتی دور میں جو اصول بیان کئے جائیں اور جن پر لوگوں کو جمع کیا جائے۔ جب اسلامی نظام کو عملاً قائم کرنے کا وقت آئے گا تو اس تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ توحید و رسالت جیسے اساسی اصولوں کے علاوہ تحریک کے مفاد کے لئے جس اصول میں ضروری خیال کرے استثنا پیدا کر لے۔ اس پر عمل کرنے سے اپنی جماعت کو روک دے۔ جو ضمانت اس تحریک نے عوام کو اپنے ابتدائی دور میں دی ہو اس میں سے جس جزو کو وہ دین کی مصلحت کے لئے مضر

خیال کرے ساقط کردے (جیسا کہ مثال میں حضورؐ نے مساوات اور حق خلافت ایسے اصول اور ضمانت پر صحابہؓ کو عمل کرنے سے روک دیا تھا) تو اس اسلامی تحریک اقامت دین کی جد و جہد اور ان طالع آزما سیاست دانوں کی تحریکات کے مابین کیا فرق باقی رہ جائے گا جو حصولِ اقتدار سے پہلے نہایت پاکیزہ اصول بیان کرتے ہیں، بہت حسین وعدے عوام سے کرتے ہیں اور انہی اصولوں اور وعدوں کی بنیاد پر وہ لوگوں کی حمایت و تائید حاصل کرتے ہیں جب انھیں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اقتدار کو قائم رکھنے کی عملی مشکلات سے مجبور ہو کر ان وعدوں اور اصولوں کی خلاف ورزی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جھوٹ بولنا بھی جائز ہے

اس پر مودودی صاحب ایک قدم اور آگے بڑھے اور فرمایا کہ اقامت دین جیسے اہم مقصد کے حصول کے لئے اصولوں میں لچک اور استثنےٰ تو ایک طرف ان کے لئے جھوٹ بولنا بھی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا

> راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ مئی سنہ ۱۹۵۸ء)

آپ حیران ہوں گے کہ مودودی صاحب نے ایسا کہنے کی جرأت کیسے کر لی اور اس کی تائید میں ان کے پاس کون سی سند ہو سکتی تھی؟ لیکن جس تاریخ سے انھوں نے پہلی سند پیش کی تھی اسی سے انھیں اس کی سند بھی مل گئی۔

حدیث سے اس کا ثبوت

چنانچہ انھوں نے جھوٹ کے وجوب میں دو تین حدیثیں نقل کر دیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ

> اسماء بنت یزید نبی اکرمؐ سے روایت کرتی ہیں کہ جھوٹ جائز نہیں ہے مگر تین چیزوں میں۔ مرد کی بات عورت سے تاکہ وہ اسے راضی کرے۔ جنگ اور اصلاح بین الناس۔ (ترمذی)

اس کے بعد انھوں نے (معاذ اللہ) نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے بھی اس کی مثالیں پیش کر دیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

> اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمؓ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انھوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظ صریح انھیں اس کی اجازت دی۔ (بخاری)

امید ہے اس سے یہ بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہو گی کہ یہ حضرات تاریخ کے اس قسم کے بیانات اور واقعات کو (جن کا خلاف قرآن اور غلط ہونا بدیہیات میں سے ہے) سچا اور دین میں سند تسلیم کرنے پر کیوں زور دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) اگر سند قرآن ہے اور اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ قرنِ اول کی تاریخ کا جو بیان

قرآن کے خلاف ہے وہ غلط ہے، تو کسی کو اپنی فریب کاریوں اور کذب تراشیوں کے لئے دینی سند نہیں مل سکتی۔ ایسا اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس قسم کے تاریخی بیانات کو دین میں سند تسلیم کرا لیا جائے۔ اور پھر انہیں اپنے فیصلوں کی تائید میں پیش کر دیا جائے۔ اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ اس طبقے کے تمام افراد اسی جذبے کے ماتحت ان باتوں کو صحیح مانتے اور صحیح سمجھتے ہیں۔ ان میں بیشتر حصہ ان افراد پر مشتمل ہے جو ان باتوں کو نیک نیتی سے سچا مانتا ہے۔ یہ اس لئے کہ صدیوں کی تقلید سے ان میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ ان کے نزدیک دین کے معاملات میں غور و فکر سے کام لینا جائز نہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ وہی صحیح ہے اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ یہ حضرات اس تاریخ کی حفاظت، و ترویج کو عین دینی خدمت سمجھتے ہیں۔ مفاد پرست طبقہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس نے اس قسم کی باتیں وضع کر کے انہیں ابتداءً ہماری تاریخ میں شامل کیا تھا۔ یہی اسے صدیوں سے مسلسل و متوارث آگے بڑھائے چلا آ رہا ہے اور یہی آج اس کے تحفظ کا سب سے بڑا علمبردار بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کی ایک مثال سنیئے

اسلام اور نظامِ سرمایہ داری

ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ قرآن نے جس نظام کو الدین کہا ہے اس میں فاضلہ دولت کسی کے پاس جمع نہیں رہتی۔ وہ نوعِ انسانی کی بہبود کے لئے امت (یا نظام) کی تحویل میں چلی جاتی ہے۔ اس باب میں قرآن کی تعلیم ایسی واضح، بین اور صاف ہے کہ اس میں کسی قسم کی تاویل و تعبیر کی گنجائش نہیں۔ ظاہر ہے کہ عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) میں قرآن کی اسی تعلیم پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن اس کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور سرمایہ دارانہ نظام ہجوم کر کے آ گیا تو اس کی ضرورت پڑی کہ اس کی تائید اور جواز کے لئے سندیں وضع کی جائیں۔ یہ اسناد قرآن سے تو مل نہیں سکتی تھیں کیونکہ اس میں تغیر و تبدل اور حک و اضافہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے لئے تاریخ کا چور دروازہ ہی کام دے سکتا تھا چنانچہ انہوں نے اس سے کام لیا اور اس قسم کی روایات وضع کیں جن سے سرمایہ داری، زمینداری اور جاگیرداری کا نظام عین مطابق سنتِ رسول اللہ و سنتِ صحابہؓ قرار پا جائے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے

مشکوٰۃ کی ایک حدیث

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹/۳۴)

جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسول تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے۔ تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔ اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا نبی اللہ یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا خداوند تعالیٰ

نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کردے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سنکر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک ایسی بہترین چیز کا پتہ نہ دوں جس کو انسان جمع کرکے خوش ہو اور وہ چیز نیک بخت عورت ہے۔ اس کی طرف مرد دیکھے تو اس کا دل خوش ہو اور جب مرد اس کو کوئی حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جب وہ غائب ہو تو اس کے مال و اولاد کی حفاظت کرے۔ (ابو داؤد) (مشکوٰۃ جلد اول۔ اردو ترجمہ صفحہ ۳۰۳)

یہ روایت زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ وضع کردہ ہے یہ کبھی تصور میں بھی آسکتا ہے کہ خدا کا ایک حکم ہو اور صحابہؓ پر وہ گراں گذرے؟ پھر ان میں سے کوئی اور بھی نہیں) حضرت عمرؓ اس حکم کو بدلوانے کے لئے رسول اللہؐ کے پاس جائیں۔ اور رسول اللہ خدا کے اس حکم کو یوں بدل دیں کہ اگر تم اڑھائی فیصد سالانہ ادا کردو تو تمہیں اجازت ہے کہ سونے چاندی کے ڈھیر جمع کرتے رہو۔ روایت کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ بعد کے دور کی وضع کردہ ہے لیکن چونکہ اس سے سرمایہ دارانہ نظام کا تحفظ ہوتا ہے اس لئے مفاد پرست گروہ اسے صحیح ترین حدیث قرار دے کر برابر آگے بڑھائے لا رہا ہے۔ اسی قسم کی روایات ہیں جو آج بھی سرمایہ داری۔ زمینداری اور جاگیرداری کی تائید میں بڑھ چڑھ کر پیش کی جاتی ہیں۔ اور جب کوئی یہ کہے کہ یہ چیزیں قرآن کے خلاف ہیں تو اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسول اللہ اور صحابہ کبارؓ زیادہ سمجھتے تھے!

چونکہ اس مقالہ میں پوری تاریخ کا استقصاء مقصود نہیں اس لئے ہم انہی مثالوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ آپ ان واقعات کو پھر سے سامنے لایئے جو خلیفۂ اول کے انتخاب کے ضمن میں ہماری کتب احادیث و آثار میں بیان ہوئے ہیں اور پھر سوچئے کہ اگر اس تاریخ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو دنیا میں اسلام اور متبعینِ اسلام کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے۔

پس چہ باید کرد؟

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب آسان ہے یعنی۔

۱۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم خدا کی کتاب ہے جو حرفاً حرفاً اپنی حقیقی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

۲۔ رسول اللہ اور آپ کے صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ لہذا

۳۔ اگر اس دور کی تاریخ میں ہمیں کوئی بات ایسی ملے جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہے تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا

چاہیئے کہ تاریخ کا وہ بیان غلط ہے۔ خواہ وہ حدیث کے کسی مجموعہ میں ہو یا کسی اور کتاب میں۔

(۴) مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں ہمیں قرنِ اول کی تاریخ کو از سرِ نو مرتب کرنا چاہیئے۔ اس تاریخ سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ اُس دور میں قرآن کریم پر اس طرح عمل ہوا تھا۔

(۵) اُس دور کے بعد قرآنی نظام باقی نہیں رہا تھا۔ اس لئے اُس وقت سے آج تک کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ نہ اسلام کی صحیح تعبیر کہلا سکتی ہے نہ ہمارے لئے دلیل اور حجت بن سکتی ہے۔ نہ ہی ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اُن لوگوں کی مدافعت میں اپنا وقت اور توانائیاں صرف کریں۔ ان کے متعلق ہم اس سے زیادہ ماننے کے مکلف نہیں کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۳۴) "یہ وہ لوگ ہیں جو گذر چکے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا اس کا نتیجہ ان کے لئے تھا تم جو کچھ کرو گے اس کا نتیجہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انھوں نے کیا کیا تھا؟"

(۶) جہاں تک قرآن کریم کے سمجھنے کا تعلق ہے۔ وہ خارج از قرآن تاریخ میں درج نہیں اسے ہر زمانہ میں براہِ راست سمجھا جا سکتا ہے۔ دین میں سند اور حجت قرآن ہے۔ اور یہی ہمارے لئے غلط اور صحیح۔ حق اور باطل کا معیار ہے۔ جو اس کے مطابق ہے وہ حق ہے جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔

جب تک ہم اس مسلک پر عمل پیرا نہیں ہوتے دین ہمارے سامنے نہیں آ سکتا۔

حسب ذیل پمفلٹس بھی ملاحظہ فرمائیے

فی پمفلٹ ۴؍ پیامِ فصلِ بہار۔ قانون شریعت۔ مقامِ محمدی۔ یتیم پوتے کی وراثت۔ دستور پاکستان اور طلوعِ اسلام (انگریزی)۔ ہماری تاریخ۔

" " ۳؍ سن ویزداں، پاکستان میں قانون سازی کا اصول، بادۂ زندگی۔ سنتِ رسول اللہ۔

" " ۲؍ خود فیصلہ کیجئے۔ رحمۃ اللعالمین۔ قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر۔ اطاعتِ رسول۔ یہ زین کس کی ہے؟ فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں؟ انتخاب۔ علماء کون ہیں؟ تقدیرِ امم تکذیبِ دین کون کرتا ہے؟ اندھے کی لکڑی۔ معاشی نظام اور اسلامی دستور کے بنیادی اصول (انگریزی)

" " ۱؍ قرآنک سوشل آرڈر۔ مقامِ اقبال۔ پیامِ اقبال۔ لمعات، دینِ خداوندی۔ افواہیں۔ اردو زبان میں نماز۔ اس پتہ سے منگوائیے:۔ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

ہماری مسجدیں

ذرا ٹھہریئے اور اُس سامنے کی گلی کا سکوں سوز منظر نگاہوں کے سامنے لایئے!

قدم قدم پر ہماری ملت کے نونہالوں کی ٹولیاں دوڑ بھاگ، کھیل کود، ہو و لعب اور رنگ رلیوں میں سرگرم کار ہیں۔ کہیں ناشش اور کیرم کی بازی لگ رہی ہے۔ کہیں گلی ڈنڈے اور گیند بلے کی مشق ہو رہی ہے۔ کہیں فحش گانے گائے جا رہے ہیں۔ کہیں کبوتر بازی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ کہیں دنگہ فساد، مار پیٹ اور گالی گلوچ کا سلسلہ بپا ہے۔ (یہ روح فرسا مناظر آپ کو ہر شہر، قصبہ و قریہ میں ہر وقت نظر آئیں گے)

اور پھر وہ دیکھئے! ایک معزز نوجوان گلی میں داخل ہوا۔ چاروں طرف یہ منظر دیکھتا چند قدم آگے بڑھا اور پھر یک بیک دم رک کر کچھ سوچنے لگا۔ چہرے کے آثار چڑھاؤ بتا رہے ہیں کہ کوئی دردمند اور صاحب فکر ہے جسے قوم کی تصویر کے اس رُخ نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ سنئے! وہ زبانِ حال سے آہستہ آہستہ حسرت ناک لہجے میں کہہ رہا ہے۔

"بارِ الٰہا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا یہی ہے ہماری وہ نسل جس نے آگے چل کر نظام مملکت کی باگیں سنبھالنی ہیں؟ کیا یہی ہیں ہماری امیدوں کے مرکز اور آرزوؤں کے وہ محور جو ملت کے آسمانِ تقدیر پر ستارے بنکر چمکیں گے کیا یہی ہیں ہمارے مستقبل کے معمار؟ یا خدا! جب ان کی تربیت کا آغاز یہ ہے تو انجام کیا ہوگا؟ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ان کے والدین کا احساس کیوں مُردہ ہو چکا ہے؟ حکومت کی ذمہ داری اور فریضہ کو کیا ہوا ہے؟

ہیجان و اضطراب کی اس کیفیت نے اسے طلسم پیچ و تاب بنا دیا ہے۔ ناگاہ قریب کے دروازے سے ایک بوڑھی ماں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ اُسی کو مخاطب کر رہی ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو بیٹا! ان شیطانوں کو کھڑے ہو کر۔ ہمارے لئے تو یہ زندگی کا مستقل روگ بن گئے ہیں ان کی صبح و شام کی شرارتوں نے تو ہماری زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے"۔

"انھیں اسکول کیوں نہیں بھیجتے بی اماں! گھر پر بے کار رہ کر یہ بچے یہی رنگ نہ دکھائیں گے تو اور کیا کریں گے؟" یہ کہتے ہوئے نوجوان کے کان بی اماں کا جواب سننے کے لئے بیتاب تھے۔ بی اماں نے کہا۔

"کیا بتاؤں بیٹا تمہیں کہ اسکول میں داخل کرانے کے لئے کتنی دوڑ دھوپ کر چکے ہیں۔ کتنی سفارشیں کرائیں لیکن ہر اسکول سے یہی جواب ملا کہ جگہ کی کمی ہے۔ داخلہ پہلے ہی گنجائش سے زیادہ ہو چکا ہے۔ مزید گنجائش قطعاً نہیں۔ آخر اب کریں تو کیا کریں؟"

یہ سن کر وہ نوجوان بڑے پُرحیرت انداز میں جس میں غم و الم کی کیفیت صاف جھلک رہی ہے بیساختہ بول اٹھتا ہے۔

"ہائیں! تو یہ سارا طوفانِ بدتمیزی اسکولوں میں جگہ کی کمی کے باعث بپا ہے؟ ہماری نئی نسل محض اس بنا پر ہلاکت کے جہنم کی طرف بڑھ رہی ہے کہ اسکولوں میں ان کے داخلہ کی گنجائش نہیں رہی؟"

اور یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہیں سامنے کی عظیم الشان عمارت کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ سر بفلک مینار چمکتے ہوئے گنبد، وسیع صحن باری باری اس کی نگاہوں کے سامنے آ رہے ہیں۔ ہاں! یہ اس محلہ کی مسجد ہے۔

"کیا یہ عظیم و وسیع عمارت ان نونہالوں کی تربیت گاہ نہیں بن سکتی؟"

نوجوان کی آواز میں اب جوش تھا۔ اس کی آواز سن کر قریب کے گھروں سے چند اہل محلہ نکل کر اُس کے پاس جمع ہو گئے اور وہ (گویا انھیں مخاطب کرتے ہوئے) بولتا چلا گیا۔

"ان مساجد میں ایسے بچوں کے پڑھنے کا انتظام کیوں نہیں کیا جاتا؟ یہ عظیم الشان عمارتیں نماز کے علاوہ سارا دن اور کس کام آتی ہیں؟ آخر اس میں کیا رکاوٹ ہے کہ جن بچوں کی زندگیاں اسکولوں میں داخلے کی عدم گنجائش کے سبب برباد ہو رہی ہیں ان کی تعلیم و تربیت کا سامان یہاں کر دیا جائے۔ ہماری مسجدیں ملک کے طول و عرض میں ہزاروں کی تعداد میں گلی گلی، کوچے کوچے پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک مسجد کی تعمیر پر ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے صرف ہوئے ہیں۔ اور اب بھی ہر سال ان کی مرمت اور دیگر انتظامات پر ہزاروں اور لاکھوں روپوں کا مجموعی طور پر خرچ اٹھتا ہے۔"

نوجوان ابھی یہاں تک کہنے پاتا ہے کہ ایک کرخت اور غضب آلود آواز سنائی دیتی ہے۔

"کیا کہہ رہے ہو تم بابو جی! ہوش کی دوا کرو۔ یہ مسجد ہے۔ خانہ خدا ہے۔ یہ نماز پڑھنے کے لئے ہے اس سے دنیاداری کے کام نہیں لئے جا سکتے۔ انھیں بچوں کے اسکول نہیں بنایا جا سکتا۔ اس طرح تو مسجدوں کا سارا احترام ختم ہو جائے گا۔ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ مسجدیں ایسے کاموں کے لئے بھی استعمال ہوں"

یہ مسجد کے امام کی آواز تھی جو نوجوان کی گفتگو سن کر آہستہ آہستہ مسجد کی سیڑھیوں سے اتر کر قریب پہنچ گیا تھا۔

نوجوان یہ سب کچھ بڑے صبر اور ضبط سے سنتا رہا۔ اُسے خطیب شہر کا وہ خطبہ یاد آگیا جو دو ہی دن پہلے انھوں نے شہر کی جامع مسجد میں دیا تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی آہستگی سے امام مسجد کو مخاطب کر کے کہا۔

"مولانا! اگر آپ یہ سب کچھ درست فرما رہے ہیں تو پھر خطیب شہر کی جمعہ کی اُس تقریر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جس میں انھوں نے فرمایا تھا اور بڑی ہی تفصیل سے فرمایا تھا کہ ۔

"اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ زندگی کا ایک جامع اور اجتماعی نظام ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ یہاں دین اور دنیا کی کوئی تفریق نہیں۔ مذہب اور سیاست میں کوئی حد فاصل نہیں عیسائیت کی طرح CHURCH اور STATE کے الگ الگ دائرے نہیں۔ اس کے نظام میں سرتاپا ایک ہی وحدت جاری و ساری ہوتی ہے اور اس وحدت میں کسی نوع کی تفریق اور تقسیم ممکن نہیں"

اور پھر اس عظیم الشان دعوے کی تائید میں انھوں نے تاریخ دین کی روشنی میں یہ روایات بھی بیان کی تھیں کہ حضور رسالت مآبؐ اور خلفائے راشدینؓ کے عہد مبارک میں تمام مسائل زندگی مسجد کے اندر ہی طے پاتے تھے۔ مختلف معاملات طے کرنے کے لئے مجالس شوریٰ مسجد ہی میں منعقد ہوتی تھیں۔ رؤسائے مملکت مسجد کے منبر سے ہی اپنے احکام اور فیصلے سُناتے تھے اور وقت آنے پر وہی نماز کی امامت بھی کراتے تھے۔

مولانا! آپ تو مسجدوں میں بچوں کی تعلیم کو خلاف شریعت قرار دے رہے ہیں۔ خطیب صاحب نے تو یہاں تک کہا تھا کہ:۔

"حکومت کے جملہ وفود بھی مسجد میں ہی ٹھہرائے جاتے تھے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ کے حیات بخش نغمے بھی مسجد نبوی میں ہی گونجتے تھے اور حضور ختم مرتبتؐ نے حبشیوں کا مشہور کھیل بھی مسجد نبوی میں ہی ملاحظہ فرمایا تھا، اور حضرت عائشہؓ کو دکھایا تھا"

اس کے بعد ہی نوجوان نے امام مسجد سے کہا۔

"مولانا! ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ ہر منبر و محراب، ہر ایوان، اسمبلی اور ہر پبلک اسٹیج سے یہی آواز سنائی دیتی ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا کی تفریق قطعاً روا نہیں۔ یہ بھی زور و شور سے اعلان کیا جاتا ہے کہ قرن اول میں مسجدیں ہمارے پارلیمنٹ ہاؤس تھیں۔ سکریٹریٹ تھیں۔ قومی دیوان خانوں کا درجہ رکھتی تھیں۔ دین کا ہر اہم معاملہ یہیں طے ہوتا تھا۔ اور دوسری طرف جب قوم کی کوئی اہم ضرورت سامنے آئے تو مذہب کے اجارہ دار مساجد پر اپنی اجارہ داری اور تصرف قائم رکھنے کے لئے اس بات کے بھی روادار نہیں ہوتے کہ ان سے نئی نسل کی بیگاری بنانے کا کام لیا جا سکے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ مسجدوں کو صرف پنجوقتہ نماز کے لئے محفوظ رکھنے کی رسم اس دورِ ملوکیت کا کرشمہ ہے۔ جب اسلام امور مملکت اور امور شریعت کے الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اس طرح

اس کی وحدت اس ثنویت اور دو عملی کی بھینٹ چڑھادی گئی۔ ورنہ مسجدیں ہمارے نظام زندگی کے تمام امور کے مرکز کا درجہ رکھتی تھیں۔ اور انھیں حسب ضرورت ملی مقاصد اور ضروریات کے لئے استعمال میں لانا تقاضائے دین تھا۔

آپ غور فرمایئے کہ ان کی تعمیر پر مجموعی طور پر کروڑوں روپوں کے عظیم صرفہ اور لاکھوں روپے سالانہ کے انتظامی اخراجات کے بعد ان سے کام کیا لیا جاتا ہے؟ کیا نماز کے اوقات کے علاوہ جو مجموعی طور پر دو تین گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہوتے۔ باقی اوقات میں ان سے کوئی کام لیا جاتا ہے۔؟

اقوام عالم میں اگر ہم باشعور قوم کہلانے کے مدعی ہیں تو یہ ضروری ہے کہ اپنی زندگی کے ان مسائل کو دیانتداری سے حل کریں اور مسجدوں سے تربیت گاہوں کا کام لے کر اس کمی کو پورا کریں جس کی وجہ سے ہماری نئی نسل تباہ ہو رہی ہے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ اول تو مدرسے بہت کم ہیں اور اس کی بنیادی وجہ عمارت کا نہ ہونا ہے۔ دوسرے، ان مدرسوں میں دور دور سے بچے آتے ہیں جن کی ٹرانسپورٹ کا کوئی تسلی بخش انتظام نہیں۔ آپ دوپہر کے وقت، جبکہ درجۂ حرارت ۱۱۲ ۱۱۳ تک پہنچ چکا ہوتا ہے کسی مدرسے کے باہر بس اسٹینڈ پر کھڑے ہو جایئے اور دیکھئے کہ قوم کے یہ ننھے ننھے پودے، چلچلاتی دھوپ میں، بس کے انتظار میں کس بے تابی سے کھڑے ہیں۔ بس آتی ہے اور ان میں سے دو چار بچوں کو لے کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں اس سے زیادہ کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ باقی ماندہ بچے پھر دوسری بس کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بجے اسکول سے چھٹی ہوئی اور بچہ چار بجے گھر پہنچا اور یہ سارا وقت دھوپ میں گذارا۔ اس کے برعکس مسجد قریب قریب ہر محلہ میں موجود ہوتی ہے۔ پھر اس کا فاصلہ ہر گھر سے دس بیس قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔ صبح کے نماز کے بعد ظہر کے وقت تک (کہ یہی عام طور پر بچوں کے اسکول کا وقت ہوتا ہے) وہ بالکل خالی پڑی رہتی ہے۔ محلے کے بچے کتنی آسانی سے اس میں تعلیم پا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مساجد کے امام، خطیب اور مؤذن جو خطبۂ جمعہ اور نمازوں کے علاوہ باقی اوقات میں بے کار رہتے ہیں، بچوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں اس مقصد کے لئے مساجد میں خطیب اور امام ایسے متعین کئے جائیں جو بچوں کو تعلیم دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک پیسہ خرچ کئے بغیر نئی نسل کے لاکھوں بے کار بچے جنھیں سکولوں میں داخلہ نہیں ملتا تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ ہو جائیں گے اور تباہی کے جس سیلاب میں اُن کی زندگیاں بہے چلی جارہی ہیں اُس سے بچا کر انھیں صحیح راستہ پر ڈالا جا سکے گا۔

ہم اربابِ حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ ہماری اس تجویز پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔

اقبال
حکیم انقلاب کی حیثیت سے

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

(محترم صفدر سلیمی صاحب کی تقریر جو انھوں نے ۱۲ اپریل کی صبح کنونشن کے اجلاس میں فرمائی۔ تعارف کے لئے کنونشن کی روئداد ملاحظہ فرمایئے۔ جو ماہ مئی کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے)

حُسنِ اتفاق کی کرشمہ سازیوں کا یہ ایک دل نواز اور وجد آفریں مرحلہ ہے کہ یومِ اقبالؒ کی قومی تقریب اور طلوعِ اسلام کنونشن کے انعقاد کی تاریخیں ایک دوسرے سے ہم آویز ہوئی ہیں اور کنونشن کے زیرِ اہتمام ہمیں حکیم الاُمت علامہ اقبالؒ اور اُن کے فلسفۂ انقلاب کی یاد تازہ کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ لیکن معاملہ محض حُسنِ اتفاق کا نہیں بلکہ فکر و نظر کی اس ہم آہنگی اور یک رنگی کا ہے جس نے اقبالؒ اور ادارہ طلوعِ اسلام کو ایک ہی رشتے میں منسلک اور ایک ہی مرکز سے ہم آغوش کر رکھا ہے۔ زندگی کی تاریک شاہراہوں پر نہ صرف یہ کہ دونوں کی منزلِ مقصود ایک ہے بلکہ ان اندھیروں میں اس کی کسبِ ضیا بھی ایک ہی سرچشمۂ نور کی رہینِ منت ہے۔

اقبال عصرِ حاضر کا ایک عظیم و جلیل حکیمِ انقلاب تھا۔ قلب و نظر کے اُجڑے ہوئے کاشانوں میں اُس کے فلسفۂ انقلاب نے جو قندیلیں روشن کیں اُن سے ہماری زندگی کے قبرستانوں میں نئے ہنگامے بیدار ہو گئے۔ تھکا ماندہ کاروانِ شوق پھر ذوقِ سفر سے مالا مال ہو کر آگے بڑھا اور سات برس بعد تاریخ کا مؤرخ تاریخ کے صفحات پر ایک ایسی مملکت کے قیام کی داستانِ جمیل رقم کر رہا تھا جو اقبال کے لازوال فکر و نظر کا شاہکار بن کر منظرِ عام پر آئی۔

ہاں! پاکستان ہے فکرِ اقبال کا وہ نادر الوجود شاہکار جس نے تاریخ عالم کا پورا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ فکرِ اقبال کی متاعِ عزیز آج بزمہائے طلوعِ اسلام کا بیش بہا سرمایہ ہے اور یہ کاروانِ شوق اس سرمائے کا حقیقی وارث بھی ہے اور مخلص امین بھی۔ اپنی منظم سعی و کاوش سے اس نے نہ صرف فکرِ اقبال کی پاسبانی کا حق ادا کیا ہے۔ بلکہ اس فکر کو محسوس و مشہود پیکروں میں ڈھال کر اُس نے اُس نظامِ زندگی کے امکانات روشن کر دیئے ہیں جن کی تڑپ اور شدّتِ آرزو نے اُس مردِ قلندر کی زندگی کو طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا۔ اسی جوشِ اضطراب میں ہم نے اُس کی یہ پکار سنی تھی کہ

اسی کشمکش میں گذریں مِری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

اور پھر آرزوئے انقلاب کی اس شدّت نے اس کے پیمانۂ صبر کو اس قدر لبریز کر دیا کہ ملّت کے اِس قلبِ حساس کی فریاد سے ضمیرِ کائنات لرز اُٹھا۔ اُس کی فریاد کس قدر سکوں سوز اور قیامت خیز تھی۔ سنئے:۔

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں

فکر و نظر کی اس وحدت کا جو پُر کیف رابطہ اقبال اور بزمہائے طلوعِ اسلام کے درمیان موجود ہے اُس کی موجودگی میں اس پلیٹ فارم سے اقبالیات کا تذکرہ ہمارے فاضل سندربین و مبصرین کے لئے کوئی نیا پیغام نہیں ہوگا لیکن یہ ضرور ہوگا کہ اس پیامِ حیات کی ترو تازگی جو اقبال اپنی ملّت کے نام چھوڑ گیا ان وارثینِ اقبال کے ذہنوں میں خود اعتمادی اور ذوقِ سفر کے نئے ولولے پیدا کرنے کا محرک ضرور ثابت ہوگی۔

آیئے کہ اس تذکرۂ جمیل کا آغاز کرتے ہوئے ماضی کے کچھ اوراق اُلٹیں اور اُس ماحول کو نگاہوں کے سامنے لائیں جس کی ویرانیوں میں پہلے پہل اقبال کے نغمۂ حیات نے ارتعاش پیدا کیا۔ اس کے اپنے الفاظ میں واماندگی اور بے راہ روی کی کیفیت یہ تھی کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں وہ مردانِ راہ داں کے لئے

کارزارِ حیات میں کاروانِ ملّت کی شکست خوردگی اور ذہنی انتشار کا یہ عالم تھا کہ

میر سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

ہر قدم بے نتیجہ اور ہر سفر بے منزل۔ اہلِ کارواں کی ہر تحریک آندھیوں کی طرح اُٹھتی۔ طوفانوں کی تندی سے کرآگے بڑھتی اور

بالآخر گرد کی طرح دم توڑ دیتی ـــ اقبال حسرتناک لہجے میں کہتا۔

اُس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

ہماری زندگی کے فلک سیر شعلے راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل ہو چکے تھے جب اُس نے آہ بھر کر کہا کہ

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اور اس پر مستزاد رہنمایانِ دین اور مفتیانِ شرع متین کی تنگ نظری، نابلندبینی اور ذہنی افلاس کا یہ حال کہ اُسے کہنا ہی پڑا۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیّل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

اور پھر ـــ

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں

آخر ان سے امید بھی کیا ہو سکتی تھی ـــ تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ :-

قوم کیا چیز ہے؟ قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

یہ تھا ہمارے ماحول کا وہ مرگ آفریں نقشہ جس میں شاعر مشرق نے زندگی کے ساز پر نغموں کو چھیڑا۔ کوئی محرم راز نہیں لیکن یہ آواز رکی نہیں۔ اُس نے کہا ـــ

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے
چمن میں ہے ابھی شاید کوئی درد آشنا باقی

اور پھر ان نغموں کی تاثیر کچھ کچھ رنگ لانے لگی۔ اندھیرے میں امید کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ جمود و سکوت کے سینوں میں ذوقِ سفر نے انگڑائی لی۔ اقبال پکار اُٹھا ـــ

ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

عراقِ دل نشیں کی نواؤں سے آہستہ آہستہ خوابیدہ عزائم نے کروٹ لی بے حسی اور واماندگی کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ فقیرِ راہ کے اشاروں میں منزل کا سراغ نمایاں تھا۔ اُس کے آتشیں نغموں سے بجھی ہوئی آگ شعلوں میں بدلنے لگی۔

شاعر کو اپنی نواؤں کا صلہ مل گیا۔ اس کی وارفتگی کا عالم نہ پوچھئے۔ وفورِ مسرت سے جھومتے ہوئے اُس نے کہا۔۔۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
چمن میں مرے رازداں اور بھی ہیں

زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی پھیلانے کے بعد اب اقبال ایک شاعر نہیں تھا۔ وہ نغمۂ شعر کی دل نوازیوں سے خوابیدہ بختِ ملت کی مسیحائی کر رہا تھا۔ عروقِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا رہا تھا۔ اس کے شعر کسی ادیب کی لن ترانیاں اور فلسفی کے خواب نہیں تھے۔ بلکہ صحیح معنوں میں وہ زندہ جاوید فلسفۂ حیات کا نقیب تھا۔ اُسے قرآن سے عشق تھا اور عشق و مستی کی اس والہانہ کیفیت میں قرآن کے ازلی و ابدی حقائق نغمۂ شعر کے نورانی سانچوں میں ڈھل ڈھل کر جو شادابیٔ قلب و نظر بن رہے تھے۔ اُس کی آتش نوائیاں بانگِ صورِ اسرافیل کی سکوں سوزیوں اور تہلکہ خیزیوں سے معمور تھیں بزمِ کہنہ کی بساط زیر و زبر ہو رہی تھی اور قلب و نظر کی پہنائیوں میں جہانِ نو کا نقشہ اُبھر رہا تھا۔ اس قیامت میں اس کی آواز سنائی دی۔۔۔

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت

بہت جلد اس کی آرزوئیں محسوس و مشہود طور پر نگاہوں کے سامنے بر آنے لگیں اور اُس نے پکار کر کہا۔۔۔

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا تھا قمار خانہ

جہانِ نو کی تعمیر کے سلسلے میں اقبال نے پہلے مشرق و مغرب دونوں کو قرآن کے نظامِ اخوت کی دعوت دی۔ اور تہذیب مغرب کے پجاریوں پر ابلیسی نظام کے نتائج و عواقب واضح کرتے ہوئے کہا۔۔۔

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہیں فسانہ
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

پھر اُس نے مشرق پر نگاہ ڈالی وہ مشرق جو جمود و شکست کے گوشوں میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اُسے کہنا پڑا کہ

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

کرتے میں بیٹھتے ہوئے اس نے اعلان کیا۔

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

قرآن نے اُسے یہی بتایا کہ رزق کے سرچشموں پر ربِ کائنات کے سوا اور کسی فرد یا گروہ کی ملکیت اور اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی۔ نوعِ انسانی کی زبوں حالیوں کی وجہ اس نے یہی پائی کہ

زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست — آنچہ از مولاست می گوئی زماست

اُس کے نزدیک خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لئے اس کا تحفہ ہے اور یہ کسی انسان کی ملکیت نہیں بن سکتی۔ یعنی

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

غور فرمایئے کہ جس معاشیات کے مسئلۂ عظیم کو حل کرنے کی مسلسل کوششوں میں زمانہ سرگرداں چلا آ رہا ہے۔ قرآن کی روشنی میں اقبال اسے کس حسن و خوبی سے نکھار کر منظرِ عام پر لے آیا۔

اقبال کے سامنے معاشیات کا وہ حل بھی آیا جو روس کی کمیونزم نے پیش کیا۔ لیکن اُس کی عقابی نگاہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ یہ حل جس نظامِ اشتراکیت کا جزو ہے وہ جسم کی پرورش سے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔ اور اُس نے شرفِ انسانی کی ربوبیت کے معاملے میں جو اصل زندگی کا معاملہ ہے اپنی بے بسی اور دیوالیہ پن پوری طرح ظاہر کر دیا۔ کمیونزم کی ساری تگ و تاز طبعی زندگی کے 'لا' تک محدود رہی اور اسی 'لا' کے گرداب میں ہمیشہ کے لئے پھنس کر رہ گئی وہ اشتراکیت کے امام کارل مارکس کو کلیم تو کہتا ہے لیکن بے تجلّی اور اسے مسیح تو قرار دیتا ہے لیکن بے صلیب حتیٰ کہ جاوید نامہ میں وہ علامہ افغانی کی زبان سے اُس کا تعارف یوں کراتا ہے۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — قلبِ او مومن دماغش کافر است

دینِ آں پیغمبرِ ناحق شناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

اشتراکیت کے دل فریب نقاب کو اُلٹتے ہوئے وہ اسے بے پردہ دیدۂ بینا کے سامنے کھینچ لاتا ہے اور کہتا ہے۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ — لا سلاطین، لا کلیسا، لا اِلٰہ

فکرِ او در تندبادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند

جسم انسانی اور ذاتِ انسانی (لا و اِلّا) کا ملاپ ہی اس قدر اہم ہے کہ اسے قائم رکھے بغیر ربوبیتِ عامہ کا کوئی فلسفہ شرفِ انسانیت کا داعی نہیں بن سکتا۔ اسی بنا پر اقبال نے کہا۔

لا و اِلّا احتسابِ کائنات — لا و اِلّا فتحِ بابِ کائنات

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون — حرکت از لا زاید از اِلّا سکون

الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت کے بعد بھی اقبال کی سوشانہ فراست نے قدم قدم پر درس کر دو اسلامیان ہند کی راہنمائی کی۔ لیکن اس مردِ قلندر کا تاریخی شاہکار وہ فتح عظیم ہے جو اُسے "معرکۂ دین و وطن" میں حاصل ہوئی۔ ہوا یُوں کہ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں جب ہندوستان کے مسلمان ہلالی پرچم کے سائے میں پہلی بار سُرعت کے ساتھ منظم ہو رہے تھے تو نیشنلسٹ مسلمانوں کے پیشوا اور شیخ کبیر مولوی حسین احمد مدنی نے بدایوں کی جامع مسجد کے منبر سے جبّہ و دستار کی پوری نمائش کے ساتھ یہ ہانک لگائی کہ

تو میں ہمیشہ وطن سے بنتی ہیں

ایک ذمہ دار عالمِ دین کی زبان سے متحدہ قومیت کا یہ نعرہ اسلام کی روح کے خلاف کھلے چیلنج سے کم نہ تھا۔ اور یہ ناممکن تھا کہ اس نازک مرحلے پر بسترِ مرگ پر پیٹے ہوئے بھی اقبال کی مہرِ سکوت نہ ٹوٹتی۔ چنانچہ ملت کا یہ قلبِ حساس تڑپا اور اس کا جوشِ اضطراب ایک آہ آتشیں بن کر یوں لبوں تک آیا۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ　　　　ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است　　　　چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　　　اگر باو نرسیدی تمام بو لہبی است

معاملہ ؔ کا نہیں۔ بلکہ مولانا مدنی نے طیش میں آکر بحث کا دروازہ کھول دیا اور شدتِ مرض کے باوجود بارگاہِ اقبال سے ایک ایسا جامع اور مفصل بیان منظرِ اشاعت پر آیا جس نے قوم ملت، اُمت اور نبوت کے بارے میں حقائقِ دین کی نقاب کشائی کا حق ادا کر دیا اور سیاسی جدوجہد کی تاریخ نے اسے ایک تاریخی دستاویز اور لازوال شاہکار کی حیثیت عطا کر دی۔ اس تاریخی بیان میں حکیم انقلاب نے مولانا مدنی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریزی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔

.... لیکن مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں بن سکتا جو انہی اصولوں پر قائم ہو جن پر انگریزی حکومت قائم ہے"

فکر و نظر کی داستانِ انقلاب میں اقبالؒ کا یہ زندہ جاوید اور فاتحانہ شاہکار دو سال کے اندر اندر تحریک پاکستان کے لئے دلیلِ راہ اور نشانِ منزل بن گیا اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قائد اعظم کی قیادت میں کاروانِ ملت نے اُس منزل پر اپنے قدم آگے بڑھا دیئے جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے میں ایک مملکتِ نَو کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور زمانے کی نگاہوں نے صدیوں کے بعد آئیڈیالوجی کی اساس پر اس ملک کو وجود پذیر ہوتے دیکھ لیا۔ اقبالؒ نے کس قدر درست کہا تھا:۔

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو　　　　تھر تھراتا ہے جہانِ چار سوئے رنگ و بو

ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رُو

اقبالؒ کے نعرۂ انقلاب نے نیشنلزم کے سومنات کو چور چور کر دیا اور مغربی جمہوریت کا وہ مشرکانہ تصور جس کے محور پر اقوامِ عالم کی تقدیریں گردش کر رہی تھیں اپنا غلط فیصلہ واپس لینے پر مجبور ہو گیا۔ عصرِ حاضر کی تاریخ میں اسلام اور ملت کی یہ ایک عدیم المثال اور لازوال فتح تھی۔

اقبال کے پاکستان کا حصول کسی جغرافیائی نقطۂ نظر کا مظہر نہیں تھا بلکہ یہ ایک مادی نشان تھا ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اس قرآنی نظام کی تشکیل کا جس کے اصول خالقِ کائنات کی بارگاہ سے وحی کے ذریعے نوعِ انسانی کو عطا کئے گئے۔ یہ ایک تجربہ گاہ تھی عالمگیر اخوت کی اساس پر انسانی زندگی میں جنتِ ارضی کی بساط بچھانے کی۔

ملتِ پاکستان اگر صحیح شعور اور اخلاص سے بے نصیب واقع نہ ہوتی تو اس کی نگاہیں اقبال کے حقیقت کش نغموں میں مملکتِ خداداد کے اس تصور کو واضح طور پر پا لیتیں جسے اس مملکتِ عزیز کا زندہ جاوید نظام بننا تھا۔ جاوید نامہ کی درخشندہ تصویریں جو اقبال نے 'مرغدین' کے عنوان سے پیش کی مملکتِ پاکستان کے نظام کا نکھرا ہوا نقشہ موجود تھا۔ سنیئے کہ یہ تصویر وہ کس حسن انداز سے صفحۂ قرطاس پر کھینچتا چلا جا رہا ہے۔

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش خوب رو و نرم خو و سادہ پوش

فکرشاں بے درد و سوزِ اکتساب رازدانِ کیمیائے آفتاب

کس ز دینار و درہم آگاہ نیست ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست

سخت کش دہقاں چراغش روشن است از نہابِ دہ خدایاں ایمن است

اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں نے کسے روزی خورد از کشتِ خوں

نے بہ بازاراں ز بیکاراں خروش نے صداہائے گدایاں درد گوش

اور اس سارے نظام کی قرار دادِ مقاصد یہ کہ

کس در اینجا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

پاکستان کے اسی اسلامی نظام کی حقیقت اس نے ایک دوسری تصویر میں یوں پیش کی:-

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

اسی نظامِ مملکت کی زبان سے اس نے افرادِ مملکت کو سمجھایا کہ اس حقیقت پر غور کرو کہ:-

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ یہ زمیں کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب
وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

مسئلہ معاشیات اور اقبال

انسانی زندگی کے موجودہ دور میں ایک نظامِ مملکت کے اندر معاشی مسئلے کو اہم ترین مقام حاصل ہے۔ اقوامِ عالم کی سیاسیات آج اسی محور پر گردش کر رہی ہیں۔ آزاد قومیں اسی کو حل نہ کرنے کے باعث اقتصادی غلامی کے بندھن قبول کرنے پر مجبور ہوتی جا رہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جو اسلامی مملکت اسے حل کر کے معاشی مساوات کی خوشگواریاں پیدا کرنے کے قابل نہ ہو سکی اُسے اسلامی مملکت کہلانے کا حق حاصل نہیں۔ ایسی صورت میں مملکتِ خداداد کا اساسی دستور پیش کرتے ہوئے اگر اقبال معاشیات کا حل پیش نہ کرتا تو اُس کے پیش کردہ تصورِ مملکت کا خاکہ نامکمل قرار دیا جاتا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کی روشنی میں مسائلِ زندگی کا حل پیش کرتے ہوئے اقبال نے بار بار معاشی مسئلے کی وضاحت حُسنِ بیان کے نئے نئے انداز سے کی۔

سُنیئے! وہ خضر سے سوال کرتا ہے:۔

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور پھر خضر کی زبان سے جواب آتا ہے کہ:۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

پھر سرمایہ داری اور اقتدار کے عشرت کدوں میں اُس نے مزدوروں کا خون سے گلگوں میں تبدیل ہوتے دیکھا تو اس کے نعرۂ انقلاب سے فضا کانپ اٹھی۔ کس قدر لرزہ خیز تھا اُس کا یہ نعرہ:۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب
من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام آنچناں زہرے کہ از دے مارہا در پیچ و تاب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب

پھر وہ "فرشتوں کا گیت" ہمیں سناتا ہے جو اس سرمایہ داری نظام کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ فرشتے گاتے ہیں۔

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

اس احتجاج کے جواب میں خدا کی بارگاہ سے انھیں حکم ملتا ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے — کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

وہ "نوائے مزدور" کے عنوان سے یوں شعلہ ریز ہوتا ہے۔

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگ ساز — مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم
مغان و دیر مغاں را نظام تازہ دہیم — بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنان چمن انتقام لالہ کشیم — بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم

دہقان سے خطاب کرتے ہوئے وہ اُسے جھنجوڑتا ہے۔

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز
ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز

لینن کی زبان سے خدا کے حضور میں اس کی مناجات سنئے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

اُس کی نگاہیں اقوام عالم کی روش کا جائزہ لیتی ہیں اور بے ساختہ پکارتی ہیں۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی روش نے جسے رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار
جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اُس کا فکر رسا دور تو قرآن کی بلندیوں اور گہرائیوں میں وقف جستجو رہا اور اس بحر بے پایاں کے عالمگیر حقائق ایک

کرۂ ارض میں بیٹھتے ہوئے اس نے اعلان کیا۔

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

قرآن نے اُسے یہی بتایا کہ رزق کے سرچشموں پر رب کائنات کے سوا اور کسی فرد یا گروہ کی ملکیت اور اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی۔ نوعِ انسانی کی زبوں حالیوں کی وجہ اس نے یہی پائی کہ

زیرِ گردوں علتِ مسکینی چراست آنچہ از مولاست می گوئی زماست

اُس کے نزدیک، خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لئے اس کا تحفہ ہے اور یہ کسی انسان کی ملکیت نہیں بن سکتی۔ یعنی

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

غور فرمائیے کہ جس معاشیات کے مسئلۂ عظیم کو حل کرنے کی مسلسل کوششوں میں زمانہ سرگرداں چلا آ رہا ہے۔ قرآن کی روشنی میں اقبال اُسے کس حسن و خوبی سے نکھار کر منظرِ عام پر لے آیا۔

اقبال کے سامنے معاشیات کا وہ حل بھی آیا جو روس کی کمیونزم نے پیش کیا۔ لیکن اُس کی عقابی نگاہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ یہ حل جس نظامِ اشتراکیت کا جزو ہے وہ جسم کی پرورش سے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔ اور اُس نے شرفِ انسانی کی ربوبیت کے معاملے میں جو اصل زندگی کا معاملہ ہے اپنی بے بسی اور دیوالیہ پن پوری طرح ظاہر کر دیا۔ کمیونزم کی ساری تگ و تاز طبعی زندگی کے "لا" تک محدود رہی اور اسی "لا" کے گرداب میں ہمیشہ کے لئے پھنس کر رہ گئی وہ اشتراکیت کے امام کارل مارکس کو کلیم تو کہتا ہے لیکن بے تجلی اور اسے مسیح تو قرار دیتا ہے لیکن بے صلیب حتیٰ کہ جاوید نامہ میں وہ علامہ افغانی کی زبان سے اُس کا تعارف یوں کراتا ہے۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل یعنی آں پیغمبرے بے جبرئیل

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است قلبِ او مومن دماغش کافر است

دینِ آں پیغمبرِ ناحق شناس بر مساواتِ شکم دارد اساس

اشتراکیت کے دلفریب نقاب اُٹھاتے ہوئے وہ اسے بے پردہ دیدۂ بینا کے سامنے کھینچ لاتا ہے اور کہتا ہے۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ

فکرِ او در تند بادِ لا بماند مرکبِ خود را سوئے الّا نراند

جسمِ انسانی اور ذاتِ انسانی (لا و الّا) کا سلسلہ بھی اس قدر اہم ہے کہ اسے قائم رکھے بغیر ربوبیتِ عامہ کا کوئی فلسفہ شرفِ انسانیت کا داعی نہیں بن سکتا۔ اسی بنا پر اقبال نے کہا۔

لا و الّا احتسابِ کائنات لا و الّا فتحِ بابِ کائنات

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون حرکت از لا زاید از الّا سکون

درمقامِ لا نیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا سازو برگِ امتاں — نفی بے اثبات مرگِ امتاں

کیمونزم نے نظامِ کہنہ کی بساط اُلٹ کر لا کے تقاضے تو پورے کر دیئے لیکن اس تخریب کے بعد اِلّا یعنی تعمیر کی مستقل اقدار کیمونزم کے بس کا روگ نہیں تھیں۔ یہ صرف وحی کے سرچشمے سے حاصل کی جاسکتی تھیں اور کیمونزم اس مو ملے میں قطعی طور پر بے نصیب واقع ہوئی اور انسانیت مادی سطح پر فولادی مشینوں کی طرح مادیت کی چاردیواری میں مقید ہو کر رہ گئی۔ وہ نہ دیکھ سکی کہ

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں

کارل مارکس کے مقابلے میں ہمارا حکیم انقلاب زندگی کی مستقل اقدار سے بے نصیب نہیں تھا وہ خمخانۂ قرآن سے سرمۂ جانفزا لے کر باہر آیا اور پھر —

کھ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتابِ آخر

اُس نے لا کے ساتھ اِلّا کا قانون مکافات بھی واضح کیا۔ اُس نے بتایا کہ انسانی ارتقار کو مادیت کی چاردیواریوں میں محدود نہیں کیا جاسکتا بلکہ

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

آئیڈیالوجی کی بنا پر عصرِ حاضر نے دو ہی انقلاب برپا ہوتے دیکھے۔ ایک روس کی سوشلسٹ ری پبلک کا انقلاب اور دوسرا پاکستان کی مملکتِ اسلامیہ کا انقلاب۔ اول الذکر کا امامِ انقلاب کارل مارکس مادیت کی چاردیواری سے آگے منزل کی نشاندہی نہ کرسکا۔ لیکن ثانی الذکر کا حکیمِ انقلاب اقبال اُس قرآنی نظام کا داعی تھا جس میں انسانی زندگی طبعی نظام کے لا سے ابدی زندگی کے اِلّا کی طرف خروج کرتی ہے اور یہی ہے شرفِ انسانی کی وہ منزلِ مقصود جس کے متعلق اقبال نے کہا۔

وہ مرغزار کہ بیمِ خزاں نہیں جس میں
غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں

میں نے اقبال کو ایک حکیمِ انقلاب کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس کا فلسفۂ انقلاب قرآن کے سرچشمۂ نور میں ڈوب ڈوب کر اُبھرا اور مستقل اقدار کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر منظرِ عام پر آیا۔ اس لئے اُس نے قلب و نظر کی دنیا میں جو انقلاب برپا کیا وہ نہ تو ہنگامی تھا اور نہ جذباتی۔ یہ ایک ایسا نظریاتی انقلاب تھا جس کے اثرات فکر و نظر کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچے اور آئندہ صدیوں تک کاروانِ ملت کی کٹھن راہیں اور دشوار گزار منزلیں اس کی تنویروں سے منور رہیں گی۔

یہ اثرات کس قدر لازوال ہیں اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مصر کی وہ سرزمین جہاں علامہ جمال الدین افغانی جیسے رہنمائے جلیل نے اسلام اور پان اسلام ازم کے بیج بوئے تھے اور ان کے بعد ان کے جلیل القدر جانشینوں مفتی محمد عبدہٗ اور علامہ رشید رضا نے یکے بعد دیگرے مدتوں تک ان دینی تصورات کی کشتِ نوبہار کی آبیاری کی تھی تھوڑی ہی مدت بعد ان کے بلند و بالا مقاصد اور مقدس مشن سے رُوگردانی اختیار کر گئی۔ مصر اور دنیائے عرب کی نئی نسل اور نئے قائدین نے اس نخلِ بہار کو اپنے ہاتھوں تہ و بالا کر کے عرب نیشنلزم کا ایک ایسا خارستان پیدا کر لیا جس کے کانٹے پورے مشرقِ وسطیٰ میں بکھرے چلے جا رہے ہیں اور عالمگیر اور عالم آرا اخوتِ اسلامیہ کی وہ جنت جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے افغانی اور اس کے جانشینوں کی زندگیاں ہمیشہ وقفِ اضطراب رہیں ایک ایسے جہنم میں تبدیل ہو چکا ہے جسے ختم کرنا اسلام کا بنیادی مشن ہے۔

لیکن وہ مقصد جو علامہ افغانی اور ان کے جانشینوں کی ان تھک اور طویل جد و جہد کے باوجود اُن کی موت کے ساتھ ہی مشرقِ وسطیٰ میں خاسر و ناکام ہو کر رہ گیا۔ اس برصغیر میں اقبال کے ہاتھوں اس جاہ و جلال سے حاصلِ تکمیل کو پہنچا کہ اس نے نہ صرف ایک عظیم مملکت کو جنم دیا بلکہ غیر اسلامی نیشنلزم کے ہر اُس طوفان کو شکست دیتا چلا گیا جس کی پشت پر نیشنلسٹ مسلمانوں کی منظم قوت اور ہندو سامراج کی سازشوں کے علاوہ بڑے بڑے امام الہند اور شیخ الہند جبہ و دستار کے تقدس سے مسلح کھڑے تھے۔ یہی نہیں بلکہ چند سال اِدھر یہاں کے طالع آزماؤں نے نشۂ اقتدار کی بدمستی میں وطنی قومیت اور مخلوط انتخاب کے سومنات از سرِ نو تعمیر کرنے کی کوشش کی تو اقبال کی پوری ملت اُنہی فلسفۂ انقلاب کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدان میں صف آرا ہو گئی جن کے زور پر ہم برطانوی امپیریلزم اور ہندو سامراج دونوں کو شکستِ فاش دے چکے تھے۔ اقبال کا یہ تصورِ حیات ماند نہیں پڑا بلکہ گردشِ لیل و نہار کے ساتھ استحکام پاتا چلا جا رہا ہے۔

صدیوں کی تاریخ کی ورق گردانی کر لیجئے۔ آخر اس حکیمِ انقلاب کے علاوہ اور کون ہے جس کے قرآنی فلسفۂ انقلاب نے بھٹکے ہوئے مسافروں کو اُن کی گم گشتہ منزل عطا کی۔ اور اس فلسفۂ انقلاب اور تصورِ حیات کے مقابلے میں ہر دوسرے فلسفۂ زندگی کو ہتھیار ڈالنے کے سوا چارۂ کار نہ رہا۔ یہی نہیں بلکہ آپ دیکھیں گے کہ جہاں علامہ افغانی اور ان کے رفقائے جلیل کا مشن وطن رنگ اور نسل کے بتوں کے ذریعے پامال کر دیا گیا وہاں اس نقیبِ اسلام نے پاکستان کے تصور سے تاریخ کا رُخ موڑ کر رکھ دیا اور آج نئی نسل اس کے پیامِ حیات کی علمبردار بن کر سینہ سپر کھڑی ہے۔

یومِ اقبال کی یہ تقریبِ سعید آج ہمیں پھر یاد دلا رہی ہے کہ پاکستان اس حکیمِ انقلاب کے فلسفۂ حیات کا زندہ جاوید شاہکار ہے اور اس شاہکار کی عظمت ملت کے ہر فرد سے مطالبہ کر رہی ہے کہ اس مملکت کی تعمیر انہی تصورات کی روشنی میں ہو جو اقبال نے ہمیں عطا کئے اور بالآخر حصولِ پاکستان کی تاریخی فتح کا مینار بن گئے۔ اس سرزمین کو اقبال کے

حسین خوابوں کی جیتی جاگتی جنت بننے کے لئے بے شک کچھ وقت چاہیئے لیکن ملت کے ہر فرد کو سوچ لینا چاہیئے کہ اس راہ میں اگر ایک قدم بھی غلط طور پر اُٹھ گیا تو تاریخ اس حادثے کے ماتم سے قیامت تک فارغ نہیں ہو سکے گی بلکہ اس مملکتِ خداداد کی صحیح یا غلط تعمیر سے اسلام اور عالمِ اسلام کی عزت اور ناموس کا سوال وابستہ ہوگا۔ حیاتِ ابدی کے عرش پیما میناروں سے اقبال کی روح آج بھی جھک جھک کر ہماری زندگی کا تماشہ دیکھ رہی ہے ۔ اور ہم آج بھی اُس کی یہ پکار سُن رہے ہیں۔

کیا اور غزنوی نہیں کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر عرب و عجم کے سومنات
ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہیں تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

وقت کی رفتار اور حالات کے تقاضوں نے ہماری ملت کو آج منزل کے ایک اہم موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ کبھی ہم ماضی کے دھندلکوں کی جانب مُڑ مُڑ کر دیکھتے ہیں اور پھر غمِ منزل کے ارمان سینوں میں لئے ہماری بے تاب نگاہیں ایک نئی امید اور نئے ولولے کے ساتھ مستقبل کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ اس افق پر فکرِ اقبال کی یہ کرن کشتیٔ نور کی طرح تیرتی دکھائی دیتی ہے ؎

صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکرِ بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی

وقت آ گیا ہے کہ ہم نئے عزائم اور نئے ولولوں کے ساتھ ظلمتوں کے ہجوم میں فکرِ اقبال کی برقِ تابندہ کو شعلِ راہ بنائیں اور اسی کی زبان سے بصد حسنِ خلوص پکاریں ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
اے زمین از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند
اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰۃِ صبح و تو بانگِ اذاں
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

ترے نفس سے ہوئی آتشِ گل تیز تر ——×—— مرغِ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صلہ

خدا اور قیصر

[۱۹۵۵ء میں طلوع اسلام ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ اس وقت اس میں بڑے اہم مضامین شائع ہوتے تھے۔ اکثر قارئین نے لکھا ہے کہ چونکہ ہفتہ وار طلوع اسلام کا فائل عام طور پر نہیں رکھا گیا تھا۔ اس لئے وہ مضامین ان کے پاس محفوظ نہیں رہے۔ اگر انہیں مناسب موقعوں پر طلوع اسلام میں دوبارہ شائع کر دیا جائے تو ایک تو ان کی اشاعت عام ہو جائے اور دوسرے انہیں فائل میں محفوظ کر لیا جائے۔ یہ تجویز معقول نظر آتی ہے۔ اس کے پیش نظر ہم زیر نظر مضمون شائع کر رہے ہیں جو ہر جون ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں بطور مقالہ افتتاحیہ شائع ہوا تھا۔ مقالہ کی اہمیت اور اس وقت اس کی اشاعت ثانی کی ضرورت مقالہ کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گی۔ طلوع اسلام]

رمضان المبارک کی انتیسویں تاریخ ہے۔ مطلع ابر آلود ہے۔ افطار کے بعد ہر شخص کی آنکھیں ایک خاص سمت کو اٹھ رہی ہیں کہ دیکھیں وہاں سے کیا فیصلہ ہوتا ہے؟ کل عید ہوگی یا ایک اور روزہ رکھنا ہوگا۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ تذبذب کی وجہ سے سینوں میں دل دھڑک رہے ہیں۔ دوکاندار دوکانوں پر سودے نہیں لگاتے کہ نہ معلوم کل کے متعلق کیا فیصلہ ہو۔ خریدار چیزیں نہیں خریدتے کہ پہلے کچھ فیصلہ ہو جائے تو پھر خریداری کی جائے۔ غرضیکہ

مملکت کا گورنر جنرل بھی انتظار میں ہے۔

وزیر اعظم بھی انتظار میں ہے۔

کابینہ کے وزراء بھی انتظار میں ہیں

قوانین ساز حضرات بھی انتظار میں ہیں

عدالتوں کے جج انتظار میں ہیں۔

فیڈرل کورٹ کا چیف جسٹس بھی انتظار میں ہے
پولیس کا انسپکٹر جنرل انتظار میں ہے۔
فوج کا کمانڈر انچیف انتظار میں ہے۔

یہ سب انتظار میں ہیں کسی کے فیصلے کے! یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب کس کے فیصلہ کے انتظار میں ہیں وہ کونسا مرکز ہے جس کی طرف مملکت کے کروڑوں انسانوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ وہ کون سی اتھارٹی ہے جس کے پیش نظر یہ تمام ارباب اقتدار و اختیار دم بخود بیٹھے وقفِ انتظار ہیں اور کوئی جرأت لب کشائی نہیں کرتا؟

یہ کروڑوں نگاہوں کا مرکز، یہ اتھارٹی اور اقتدار کا سب سے بڑا سرچشمہ کراچی کی ایک مسجد ہے جس میں دو تین مولوی صاحبان، بڑے عزم و تمکنت سے بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں کہ کل کے لئے عید کا فیصلہ کر دیا جائے یا ایک روزہ اور رکھا دیا جائے۔ اگر انھوں نے کہہ دیا کہ کل عید ہے تو کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ کل کا روزہ رکھے۔ اور اگر ان کا فیصلہ یہ ہوا کہ کل کا روزہ رکھنا ہوگا تو کسی کو اس کی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ عید کر لے۔ ان کے اس فیصلے کے خلاف نہ گورنر جنرل دم مار سکے گا نہ کمانڈر انچیف۔ نہ کوئی جج اس کے خلاف جا سکے گا نہ چیف جسٹس۔ سب کو اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔ نہ ان میں سے کوئی، اس فیصلے سے پہلے، اس معاملہ میں دخل دے سکتا ہے۔ نہ فیصلہ صادر ہونے کے بعد اس کے خلاف کہیں اپیل ہو سکتی ہے۔ پوری کی پوری قوم پر ان کی حکومت ہے۔ حالانکہ قوم ان فیصلہ کرنے والوں کو خوب جانتی پہچانتی ہے۔ حتیٰ کہ جس وقت لوگ ان کے فیصلہ کا انتظار کر رہے تھے اُس وقت بھی ان کے متعلق آپس میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود فیصلہ انہی کا ماننا تھا نہ کسی اور کا۔ غور کیجئے کہ ان حضرات کی حکومت کتنے بڑے اقتدار و اختیار کی حکومت ہے

فیصلہ دینے کے بعد ان میں سے ایک صاحب اپنی گاڑی پر روانہ ہوئے۔ چوراہے پر پہونچے تھے۔ کہ ٹریفک کے سپاہی نے سیٹی بجا کر روک لیا اور کہا کہ گاڑی کی بتیاں کیوں نہیں جلائیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک بتی تو جل رہی ہے۔ دونوں کی کیا ضرورت ہے۔ سپاہی نے ڈانٹ کر کہا کہ بتیوں کا حکم چیف کمشنر صاحب کا دیا ہوا ہے۔ اس میں آپ کو مجالِ گفتگو نہیں۔ انھوں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے پرچہ کاٹ کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا کہ کل دس بجے تیموری صاحب کی عدالت میں پیش ہونا ہوگا۔

کل عید ہوگی یا نہیں ہوگی ـــــ اس کا فیصلہ مسجد کے ملا کریں گے۔
گاڑی کی بتیاں کس طرح جلائی جائیں گی ـــــ اس کا فیصلہ چیف کمشنر صاحب کریں گے۔
ایک ہی مملکت میں، ایک ہی شہر میں دو متوازی حکومتیں!!!

ایک اور منظر سامنے لائیے:

پولو گراؤنڈ (کراچی) میں عید کی نماز کا اجتماع ہے۔ لاکھوں کا مجمع ہے۔ گورنر جنرل صاحب تشریف فرما ہیں وزیر اعظم صاحب بھی دوزانو بیٹھے ہیں۔ کابینہ کے وزراء، چیف کمشنر، مجلس آئین ساز کے اراکین سب موجود ہیں سندھ چیف کورٹ کے جج بھی۔ اور اتفاق سے فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس بھی۔ سب کسی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ وقت گزرتا جارہا ہے۔ ہر ایک آنکھیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا ہے۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ بالآخر ایک عبا و قبا میں ملبوس مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ انھیں آتا دیکھ کر بہت سی آنکھوں میں تحقیر کی ہنسی پھر جاتی ہے۔ بہت سے خندۂ زیر لبی سے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ آکر مصلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور سب لوگ صف بستہ ان کے پیچھے خاموشی سے ایستادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ جھکتے ہیں تو سب جھکتے ہیں وہ اٹھتے ہیں تو سب اٹھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ منبر پر تشریف لے جاتے ہیں اور جو جی میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں یہ سنتے ہیں اور جی ہی جی میں ہنستے ہیں۔ کیونکہ ان کی باتوں میں سے اکثر ایسی ہیں جن پر ہر صاحب عقل و ہوش کو ہنسی آجائے لیکن انھیں علانیہ ہنسنے کی جرأت نہیں۔ جب تک امام صاحب کا جی چاہا انھوں نے انھیں باندھ کر بٹھائے رکھا۔ کسی میں اتنا کہنے کی ہمت نہیں کہ وقت زیادہ ہو رہا ہے۔ ہمت اور جرأت کیسے ہو؟ یہاں ان کی حکومت ہے۔ یہاں انہی کے فیصلے چلیں گے۔ بہرحال انھوں نے خطبہ ختم کیا۔ دعا مانگی۔ محفل برخاست ہوئی۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ یہ ایک طرف سے تیزی سے نکلنے لگے تو سپاہی نے ڈانٹ دیا کہ دیکھتے نہیں کہ یہ راستہ حضور گورنر جنرل کے لئے مخصوص ہے۔ ادھر ہٹ کر چلو۔ یعنی تمہاری حکومت کا دائرہ اور تھا۔ اب تم کسی اور کی مملکت میں پہنچ گئے ہو!

ایک ہی میدان میں، پانچ منٹ کے اندر اندر، حکومتیں بدل گئیں

* * * *

اور تیسرا منظر بھی۔

جناب وزیر اعظم کے صاحبزادے کی شادی ہے۔ گورنر جنرل صاحب تشریف فرما ہیں۔ وزرائے سلطنت، عمائد مملکت، اراکین مجلس آئین ساز، بڑی بڑی عدالتوں کے جج۔ سب زیب دہ محفل ہیں۔ دولہا مجلس میں ہے اور دولہن اندر کمرہ میں۔ سب کسی کے انتظار میں ہیں۔ رہ رہ کر دروازے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ دیر ہوتی جارہی ہے چہ میگوئیاں سب کرتے ہیں لیکن سب بے بس سے ہیں۔ کافی انتظار کے بعد مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں سب تعظیم سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ (دولہا کے باپ) وزیر اعظم صاحب کو حکم دیتے ہیں کہ آپ اندر چلیے وہاں یوں کیجیے اور یوں کیجیے۔ فلاں فلاں کو ساتھ لے جائیے۔ گورنر جنرل صاحب! آپ ادھر تشریف لائیے۔ چیف جسٹس

صاحب! میں جو کچھ کہوں آپ اس کے گواہ رہیئے۔ وہ سب تعمیلِ ارشاد کرتے ہیں۔ اس کے بعد، وہ کچھ الفاظ کہتے ہیں، دولہا ان الفاظ کو دُہراتا ہے۔ ساری محفل ساکت و صامت بیٹھی ہے۔ پھر وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں جتنا وقت جی چاہے دعائیں لگا دیتے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ ان سے سبقت کر کے اپنی دعا پہلے ختم کر لے۔ اس کے بعد وہ وزیرِ اعظم صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کے صاحبزادہ کا نکاح، احکامِ شریعت کے مطابق بحسن و خوبی تکمیل پا گیا۔ انھوں نے جو کچھ کیا اس میں کسی کو دخل دینے کی اجازت نہ تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس نکاح کے متعلق ایک تنازعہ پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے لئے کوئی ان مولوی صاحب کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ بلکہ معاملہ اس عدالت تک پہنچتا ہے جسے وزیرِ اعظم صاحب کی حکومت نے مقرر کر رکھا ہے معاملہ ایسا ہے جس کے لئے پہلے سے واضح قانون موجود نہیں۔ لہٰذا ایک نیا قانون بنانے کے لئے اسے مجلسِ قانون ساز کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اِدھر یہ ہوتا ہے اور اُدھر سے مولوی صاحبان کی طرف سے آواز آتی ہے کہ نکاح و طلاق کے بارے میں قانون بنانے والے تم کون ہوتے ہو؟ تمہیں یاد نہیں کہ یہ نکاح خود ہمارا پڑھایا ہوا ہے جب تم سب موجود تھے اور مولوی صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ جب تمہیں نکاح پڑھانے کا حق نہیں تھا تو اب نکاح کے متعلق قانون بنانے کا حق کیسے حاصل ہو گیا۔ یہ ہمارے حدود و اختیارات کے معاملات ہیں جن میں تم دخل انداز نہیں ہو سکتے۔

غور کیجئے، کیا پاکستان کی آئین سازی کی ہشت سالہ تاریخ، اسی کشمکش و نزاعِ حدود و اختیارات ہی کی داستانِ الم انگیز نہیں؟ کیا یہاں آٹھ سال سے یہی نہیں ہو رہا کہ "قوم کے نمائندے" ایک آئین بناتے ہیں اور "خدا کے نمائندے" یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیتے ہیں کہ تمہیں اس آئین سازی کا حق ہی حاصل نہیں۔ یہ مملکت اسلامی ہے۔ یہاں شریعت کا نظام نافذ ہو گا۔ اور نظامِ شریعت کے مطابق آئین و قوانین سازی کے حقدار ہم ہیں تم نہیں ہو! "قوم کے نمائندے" کہتے ہیں کہ نہیں! ہمیں اس کا حق حاصل ہے۔ یہ کہتے ہیں اور ساتھ ہی عید کے چاند، نماز اور خطبہ اور اپنے بچوں کے نکاح کے لئے فیصلہ "خدا کے نمائندوں" سے طلب کرتے ہیں۔ بات بالکل صاف ہے۔ اگر رویتِ ہلال، خطبہ عید اور نکاح خوانی میں فیصلہ کا حق مولوی کو حاصل ہے تو یقیناً قانون سازی کا حق بھی اسی کو حاصل ہونا چاہیئے۔ اور اگر قانون سازی کا حق اسے حاصل نہیں تو پھر ان امور میں فیصلوں کے لئے اس کی طرف کیوں رجوع کیا جاتا ہے؟ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ معاملات "شریعت" سے متعلق ہیں۔ اس لئے ان کے لئے ارباب شریعت ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ یہ ہے وہ اصلی نکتہ جس کی وضاحت کے لئے ہم نے اس قدر طویل تمہید اٹھائی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں امورِ شریعت اور امورِ دنیا دو الگ الگ شعبوں سے متعلق ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے

تو پھر ایک دفعہ بیٹھ کر اس کا فیصلہ کر لینا چاہیئے اور دونوں دوائر کی الگ الگ فہرستیں مرتب کر کے خدا کو خدا کی مملکت اور قیصر کو قیصر کی حکومت دیدینی چاہیئے۔

لہذا اگر یہ دوائر الگ الگ نہیں تو پھر اس شرک جلی کو ختم کرنا چاہیئے کہ رویت ہلال کا فیصلہ مسجد میں ہو اور عید کی تعطیل کا فیصلہ وزارت امور داخلہ میں۔ مقام اجتماع عید کا تعین چیف کمشنر کی طرف ہو اور عید کی نماز مُلّا جیون پڑھائیں۔ وزیر اعظم صاحب کے لڑکے کا نکاح مولوی صاحب بندھائیں اور نکاح کے متعلق قوانین کا اجراء وزیر اعظم صاحب فرمائیں!

یاد رکھیئے! ایک مملکت میں بیک وقت دو بادشاہ کبھی نہیں سما سکتے۔ جہاں ایسا ہوگا انارکی پھیل جائیگی اسکو یہیں قیصری قیصر ہے۔ وہ خدا کو اپنے ہاں آنے نہیں دیتے۔ ویٹیکن (پوپ کی مملکت میں) "خدا ہی خدا" ہے وہ قیصر کو اس مملکت میں قدم نہیں رکھنے دیتے۔ انگلستان میں "خدا" کو گرجے کی چاردیواری میں مقید کر دیا گیا ہے، اور اس سے باہر قیصر کی مملکت ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی مملکت میں آجا نہیں سکتے۔ لیکن ہم ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں "خدا اور قیصر" کی متوازی حکومت جاری کر رکھی ہے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے (یعنی قرآن کے الفاظ میں) پستیوں اور بلندیوں میں ہر جگہ فسادی فساد ـــــ کوئی چیز اپنے اصلی اور ٹھیک مقام پر نہیں اور تماشا یہ کہ ہر منبر اور ہر اسٹیج سے یہ آواز بھی برابر بلند ہوتی رہتی ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دین اور دنیا الگ الگ نہیں۔ ایسی "خالص منافقت" بھی دنیا میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آئی ہو۔ جب تک یہ دوعلی اور منافقت ختم نہیں کی جائے گی، آپ کا ایک قدم بھی تعمیری منزل کی طرف نہیں اٹھ سکے گا۔

قرآن کا فیصلہ اس باب میں بالکل واضح ہے۔ اس کی رو سے دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے نہیں مملکت کا نظم و نسق، ہدایت خداوندی کی روشنی میں، تمام ملت کی مشترک ذمہ داری ہے۔ اس میں نہ کوئی خدا کا الگ نمائندہ ہے نہ قیصر کا۔ جب نظم و نسق مملکت کے اس قرآنی تصور کے بجائے، ہمارے ہاں قیصر (سلاطین) پیدا ہو گئے تو ان کے ساتھ ہی خدائی نمائندے (ارباب شریعت) بھی معرض وجود میں آ گئے۔ لہذا اگر آپ نے قیصریت کو مٹانا ہے تو اس کے لئے مذہبی پیشوائیت کو ختم کرنا نہایت ضروری ہے۔ جب تک آپ کے ہاں قیصریت یا پیشوائیت کا ذرا سا عنصر بھی باقی ہے، مملکت کا نظم و نسق (قرآنی ہدایت کے مطابق) ملت کے سپرد کبھی نہیں ہو سکتا۔

لیکن پیشوائیت کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے اس لئے اس کے حل کے لئے غور و فکر اور عملی اقدام کی ضرورت ہے مذہبی پیشوا (مولوی حضرات) کوئی ایسا ہنر نہیں جانتے جس سے وہ اپنی روزی آپ کما کھائیں۔ تقسیم سے پہلے پاکستانی علاقہ کی تمام مساجد آباد تھیں اور مذہبی مدرسوں کی آسامیاں بھی پُر تھیں۔ یہاں سے جو غیر مسلم ہندوستان کی

طرف چلے گئے وہ اور سب کچھ تو چھوڑ گئے۔ لیکن مسجدیں اور مذہبی مکتب تو چھوڑ کر نہیں گئے۔ اُدھر ہندوستان سے جس قدر مولوی صاحبان اِدھر آئے، وہ اپنے ساتھ مسجدیں اور مکتب لے کر نہیں آئے۔ اب سوچئے کہ جس ملک میں اس قسم کے بے کار لوگوں کا اتنا جم غفیر ہو جائے اور ان کے لئے سینگ سمانے کی کوئی جگہ نہ ہو، وہ اپنی "خدائی نمائندگی" کے دعوے کو چھوڑ دیں تو روٹی کہاں سے کھائیں؟ یہ ہے یہاں کا اصل مسئلہ۔ جمیعت العلماء ہو یا مجلس احرار۔ جماعتِ اسلامی ہو یا نظامِ اسلام، سوال سب کے ہاں معاش کا ہے۔ لہٰذا جب تک قوم ان کے معاش کا انتظام نہیں کرے گی، یہ قوم کی پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ جان کی حفاظت (PRESERVATION OF SELF) حیوانی جبلت کا بنیادی تقاضا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس تقاضے کی تسکین کا انتظام کرنا ضروری ہے بنابریں کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) اس کا اعلان کر دیا جائے کہ اسلامی مملکت میں الگ مذہبی پیشواؤں کے وجود کی گنجائش نہیں۔

(۲) موجودہ مولوی صاحبان کے معاش کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا جائے۔

(۳) آئندہ کے لئے الگ مذہبی مدارس کو قانوناً بند کر دیا جائے۔

(۴) دین کی تعلیم انہی مدرسوں اور کالجوں میں دی جائے جو آج محض دنیاوی تعلیم کے لئے جاری ہیں۔ اور

(۵) مملکت کا آئین نمائندگانِ ملت کے باہمی مشورہ سے اس طرح مرتب کر لیا جائے کہ اس میں کوئی چیز قرآن کی مقرر کردہ حدود سے ٹکرائے نہیں۔

اگر پاکستان نے یہ کچھ کر لیا تو یہ نہ صرف زندہ رہ سکے گا بلکہ پائندہ سے پائندہ تر ہوتا چلا جائے گا۔ اگر اگر ایسا نہ کیا اور موجودہ دوعملی اسی طرح سے رہی تو یہ دن بدن تباہی کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے جس کی نتیجہ خیزی کسی کے روکے رک نہیں سکتی۔

اگر ملک میں کوئی ایسا طبقہ موجود ہے جسے اپنی حفاظت، آنے والی نسلوں کی سلامتی، پاکستان کی بقا، اور شرفِ انسانیت سے بہرہ یاب ہونے کا کچھ بھی احساس ہے تو اسے سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیئے اور زندگی اور موت کے اس اہم سوال کا فیصلہ کر کے اٹھنا چاہیئے۔

زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نہ ماند

جنوری ۱۹۵۳ء کا طلوعِ اسلام کوئی صاحب فراہم کر سکتے ہوں تو مندرجہ ذیل پتہ دی۔ پی کر دیں۔

جناب فیروز علی بھٹی صاحب ترجمان بزم طلوعِ اسلام۔ الکوثر۔ مری روڈ۔ راولپنڈی

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے صرف پچیس ۲۵ سال بعد اسلامی مملکت کے دارالخلافہ منورہ کے اندر

خلیفۃ المسلمین حضرت عثمانؓ دن دہاڑے شہید کر دیئے گئے

اس کا ذمہ دار کون تھا؟

اس اہم اور نازک سوال کا محققانہ جواب

مصر کے نامور (نابینا) مورخ

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

کی شہرۂ آفاق تصنیف

الفتنۃ الکبریٰ

میں ملے گا

جس کا اردو ترجمہ چھپ کر شائع ہو گیا ہے

قیمت مجلد (گرد پوش) چھ روپے

جلد منگا لیجئے

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵-بی - گلبرگ کالونی - لاہور

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

دینِ اسلام کا مقصدِ عظیم اور اُس کا طریقِ کار

(محترم مرزا محمد خلیل صاحب کی تقریر جو انھوں نے ۲۰ اپریل کی صبح کنونشن کے اجلاس میں فرمائی۔ تعارف اور استدراک کے لئے کنونشن کی روئداد ملاحظہ فرمایئے جو ماہ مئی کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے)

یوں تو قرآن کریم کی دو مختصر لیکن جامع اصطلاحات یعنی اقامت الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ میں اسلامی نظام کے شجرِ طیبہ کے برگ و بار کی ساری حقیقت مضمر ہے۔ لیکن اس کی تفصیل طول طویل ہے جس کے لئے بہت سے وقت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس مختصر صحبت میں مسئلے کے اہم پہلوؤں ہی کو سامنے لایا جا سکے گا۔

دین کی عمارت کی بنیاد خالصتہً وحی الٰہی پر ہوتی ہے۔ اور وہ اُن افراد کو جو وحی کے پیش کردہ فلسفۂ حیات (IDEOLOGY) پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لاتے ہیں۔ ایک عملی نظامِ حیات یا ضابطۂ زندگی دیتا ہے جو انسان کی تخلیق کے مقصود کو سامنے رکھتے ہوئے جماعتِ مومنین کی زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہوتا ہے۔ اسے دین کہتے ہیں۔

بخلاف اس کے مذہب، جو ایک غیر قرآنی لفظ ہے۔ بالعموم دین کی مسخ شدہ صورت کا نام ہے۔ جو خارجی اثرات یا (VESTED INTERESTS) کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں کے لئے صرف پرستش و رسومات کی ادائیگی میں عارضی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ باقی رہے زندگی کے عملی گوشے سو ان کے لئے یہ کوئی رہنمائی نہیں دیتا اور اسے افراد کی صوابدید پر چھوڑتا ہے کہ جس طرح جی میں آئے معاملات کے فیصلے کریں۔ اور اس طرح روح اور مادہ اور مذہب اور دنیاداری کی ثنویتیں (DUALISM OF STATE AND RELIGION) متوازی طور پر علیحدہ علیحدہ قائم رہتی ہیں۔

وحی کا عطا فرمودہ دین اوّلاً اس بنیادی حقیقت سے روشناس کراتا ہے کہ انسان کی زندگی کائنات کی دیگر اشیاء کی طرح محض جسمانی (PHYSICAL) نہیں بلکہ اسے جسم سے زیادہ اہم ایک اور شے۔ انسانی

ذات بھی خوابیدہ یا ناتربیت یافتہ شکل (UNDEVELOPED FORM) میں عطا ہوئی ہے۔ اس ذات کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما مقصودِ زندگی ہے۔

اس نشوونما (DEVELOPMENT) کا طریق دین کی رو سے یہ قرار پاتا ہے کہ ہر فرد دوسرے افراد کی نشوونما کے لئے اسباب و ذرائع بہم پہنچائے۔ اور ہر آن اپنے مفاد پر دوسروں کے مفاد کو ترجیح دے تاکہ اس طرح اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔

انسانی عقل کی اس کمزوری کا علاج کہ وہ اپنے مفاد کے مقابلے میں بالعموم دوسروں کے مفاد کو ترجیح دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی — "دین" اس طرح کرتا ہے کہ وہ کچھ مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) دیتا ہے جس میں سب سے مستقل اور پہلی قدر خود انسانی ذات ہے۔ یہ افراد ان مستقل اقدار کی حفاظت کو اور تمام اقدار پر مقدم رکھتے ہیں اور سب سے پہلی اور بنیادی مستقل قدر یعنی انسانی ذات ان کے لئے معیار کا کام دیتی ہے۔ جس کی نہایت سادہ اور بین توضیح اس ضرب المثل سے ہوتی ہے کہ مال صدقۂ جان اور جان صدقۂ آبرو۔

ان افراد کے نصب العین حیات کو بروئے کار لانے کے لئے دین ایک معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔ یہ معاشرہ ہر فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری 'خدائے رب العالمین' کے نام پر اپنے سر لیتا ہے کہ قرآن کے ارشاد نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ (۱۷/۳۱) کا یہی مفہوم ہے۔ وہ افراد کو ان کی نجی ضروریات کے فکر کی دامنگیری کے دائمی چکر سے چھڑا کر دوسروں کی فکر کرنے کے لئے فارغ کر دیتا ہے۔

لیکن عملاً یہ معاشرہ اتنی بڑی ذمہ داری کو اُس وقت تک پورا نہیں کرتا۔ جب تک بنیادی وسائل پیداوار اس کے اختیار و تحویل میں نہ دے دیئے جائیں۔ چنانچہ وہ خدائے رب العالمین کے نام پر افرادِ معاشرہ سے ایک بیعت لیتا ہے یا معاہدہ کرتا ہے۔ جس کی رُو سے وہ اپنا جان و مال برضا و رغبت اس نظام کی تحویل میں دے دیتے ہیں۔ اور معاشرہ اس کے بدلے میں اُن کے لئے ایک جنت کے حصول کی خوشخبری دیتا ہے۔ جو اوّلاً اسی زندگی میں تمکن فی الارض اور ہر قسم کی فراخیوں کی جنتِ ارضی کی شکل میں مشہود ہوتی ہے۔ اور اس کا سلسلہ آخرت کی جنت سے جو حیاتِ بعد الممات میں ہوگی جا ملتا ہے۔ قرآن کریم میں جو جنتی معاشرے کی اکثر تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔ وہ اسی جنتِ ارضی سے متعلق ہیں۔ جنتِ اُخروی کی صحیح کیفیت کا ادراک اپنے ہم موجودہ شعور کی سطح پر نہیں کر سکتے۔

یوں یہ نظام جو خدائے خبیر کے نام پر اطاعت لیتا ہے اور افرادِ معاشرہ کے جان و مال بھی اس کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ خدا کے ان وعدوں کو پورا کرنا اپنا ذمہ قرار دیتا ہے۔ جنہیں خدا براہِ راست پورا نہیں کیا کرتا۔

حتیٰ کہ اگر ایک فردِ معاشرہ بھی اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائے تو یہ مملکت اسلامی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

دوسری طرف صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ افرادِ معاشرہ کا اوروں کی خاطر بڑے سے بڑا ایثار بھی کسی اجر، احسان جتانے، شکریہ یا دکھاوے کی اغراض کے لئے نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں، خالصتاً للہ۔ لوجہ اللہ یا فی سبیل اللہ یعنی بلا معاوضہ ہوتا ہے۔ اور ہر آن اُن کا اعلان پیغمبرانہ سنت کی اتباع میں یہ ہوتا ہے۔ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ میری زندگی کی تمام تگ و دو اور میری موت سب خدا کے لئے ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

زندگانی چیست کانِ گوہر است	تو امینی صاحبِ او دیگر است
طبعِ روشن مردِ حق را آبر است	خدمتِ خلقِ خدا مقصودِ اوست
خدمت از رسم و رہِ پیغمبری است	مزدِ خدمت خواستن سوداگری است

البتہ انھیں جو اجر بلا مانگے از خود ملتا چلا جاتا ہے۔ وہ حقیقت بیں نگاہوں میں بہت بیش بہا ہوتا ہے۔ مثلاً

(۱) اس دنیا کی زندگی میں خوف و حزن یعنی بیرونی خطرات اور ذہنی کاوشوں سے مامون رہنا۔

(ب) عزت کی روٹی یعنی بنیادی ضروریات اور تمکن فی الارض جیسی نعمتوں کا حاصل ہونا۔

(ج) ذات (PERSONALITY) کی ایسی نشوونما جس میں صفاتِ خداوندی (بشریت کی حدود کے اندر) خود اُن کی ذات میں مشہود (MANIFEST) ہونے لگیں۔

(د) ایسی جنت جس کی بہاریں کبھی ختم نہ ہوں۔

(ہ) اور سب سے زیادہ قیمتی اور افضل شے۔ صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے چلے جانا۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ہ

ان مقاصدِ عالیہ کو بروئے کار لانے کے لئے دین کی رُو سے یہ ضروری نہیں کہ معاشرہ کو کسی جامد پیکر میں متشکل کیا جائے جس میں کبھی تغیر و تبدل نہ ہو سکے۔ قرآن کریم میں اس کے جو خط و خال مذکور ہیں۔ ان کی حیثیت در اصل ایک بنیاد کی سی ہے۔ جس پر دین کی عمارت کا قصر (SUPERSTRUCTURE) استوار کیا جاتا ہے قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دین کے متعلق کچھ بنیادی اصطلاحات مستعمل ہیں۔ جو زمانہ نزولِ قرآن میں اپنا ایک متعین مفہوم رکھتی تھیں۔ بد قسمتی سے یہ مرورِ زمانہ کے ہاتھوں بدل کر کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اور اب ان بنیادی تصورات کو پھر انہی معنوں میں ذہن نشین کئے بغیر جن میں قرنِ اول کے مسلمانوں نے انھیں سمجھا تھا۔ ہم ان اصطلاحات کے اصلی مفہوم کو نہیں پا سکتے۔

دین کی ان بنیادی اصطلاحات کی اہمیت کا اندازہ ہمیں دورِ حاضرہ کی مستعمل اصطلاحات مثلاً

افرنگ یا یورپین کلچر کی جامعیت سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ جس طرح یہ اصطلاحیں مغربی طرزِ زندگی کے جملہ گوشوں کا تصور بیک وقت سامنے لے آتی ہیں۔ اسی طرح قرآن میں اَلصَّلٰوۃ کی اصطلاح دین کے بنیادی تصور کو سامنے لانے کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ مقامِ تاسف ہے کہ یہ لفظ مسلمانوں میں صرف نماز کے ہم معنی ہو کر رہ گیا حالانکہ جسے ہم نماز سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اس جامع اصطلاح الصَّلٰوۃ کا جو پورے نظامِ زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ صرف ایک جزو یا (ASPECT) ہے۔

اِقَامَتِ الصَّلٰوۃ کے ساتھ قرآن کریم نے ایک اور بنیادی اصطلاح وَ اِیْتَآءِ الزَّکٰوۃ استعمال کی ہے جس کے معنی بالعموم ایک مدت مقررہ کے بعد اپنے مال میں سے کچھ خیرات کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً اس سے انسانوں کو نشو و نما دینا (GROWTH) مراد ہے۔ ان دونوں اصطلاحات کو قرآن میں سینکڑوں مقامات پر اکثر یکجا اور کہیں کہیں علیحدہ بھی استعمال کیا گیا ہے۔

اصل میں یہ دونوں اصطلاحات دین کے طریق کار کے دو پہلو ہیں جن کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اقامت الصلوٰۃ اور ایتاء الزکوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ نظامِ صلوٰۃ قائم کیا جائے۔ تاکہ نوعِ انسانی کی نشو و نما ہو جائے۔

اَلصَّلٰوۃ کا لفظ اپنے اندر افراد معاشرہ میں نفسیاتی تغیرات کا ہمہ گیر نظام لئے ہوئے ہے اور اَلزَّکٰوۃ میں انہی افراد کی ربوبیت۔ نشو و نما یا (GROWTH) کے مکمل اسباب و ذرائع مضمر ہیں۔

عربی مبین کی رُو سے الصَّلٰوۃ کے لغوی معنی کسی کے پیچھے پیچھے جانے کے ہیں اور مُصَلِّی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو RACE میں پہلے گھوڑے کے پیچھے لیکن اس کی پیٹھ سے ملا ہوا جا رہا ہو۔ اس کے خلاف جس گھوڑے کی کیفیت ادھر ادھر بھاگنے کی ہو۔ وہ مصلی نہیں ہو سکتا۔ گویا روگردانی کرنا یا ادھر اُدھر نکل جانا کیفیتِ صلوٰۃ یا مصلی ہونے کے منافی ہے۔

قرآن کریم کی آیہ کریمہ

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (۷۵/ ۳۱-۳۲)

وہ تصدیق نہیں کرتا اللہ ہی صلوٰۃ کا پابند ہے۔ لیکن تکذیب کرتا اور گریز کی راہیں نکالتا ہے

مذکورہ بالا مفہوم کی مزید وضاحت کرتی ہے صَلّٰى، تَوَلّٰى کی ضد ہے۔ جیسے صَدَّقَ، کَذَّبَ کی ــــ صَلّٰى کسی شے کے ایک معینہ نظامِ زندگی کے بالکل پیچھے چلے جانے کو کہتے ہیں۔

صلوٰۃ کے اس مفہوم کی تائید قرآن کے متعدد مقامات سے ہوتی ہے۔ مثلاً جہاں پرندوں کا اپنے راستے (TRACKLESS WAY) پر ایک معین پروگرام کے مطابق فضا میں لامحدود مسافت طے کرتے ہوئے چلے جانے

کا ذکر ہے۔ وہاں کہا ہے۔ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ۲۴/۴۱ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتا ہے۔ یقیناً یہاں صلوٰۃ کے معنی وہ نماز نہیں جو پڑھی جاتی ہے۔ یہاں صلوٰۃ کے علاوہ ایک اور اصطلاح "تسبیح" بھی استعمال ہوئی ہے۔ اَسْبَحَ گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے یا پورے ہاتھ پاؤں پھیلا کر تیرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ گویا "تسبیح" پوری توانائی سے معینہ پروگرام میں سرگرم رہنے کو کہتے ہیں۔ اور اس سے صلوٰۃ کے مذکورہ بالا مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں دو ملتی جلتی آیات مختلف مقامات پر آئی ہیں۔

(۱) اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۱/۵ یہ ایک سیدھے اور متوازن راستے پر چلنے کی دعا ہے۔

(۲) اِنَّ رَبِّي عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۱۱/۵۶ بے شک میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے۔

اس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ آگے آگے خدا کی صفت ربّ العالمینی ہے اور پیچھے پیچھے اُس کی اتباع کرتی ہوئی جماعتِ مومنین۔ جنھیں یہ تاکید کی گئی ہے کہ وَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ ۲/۱۳۲ تمہیں زندگی کے ہر سانس میں اسی طرح احکام و قوانینِ خداوندی کا مکمل اتباع کرنا ہے۔

قرآن کریم میں جہاں کہیں عبادت یا عبودیت کا ذکر آیا ہے۔ اُس سے مراد یہی اتباعِ احکام یا (SERVICE) ہے۔ مقامِ تعجب ہے کہ عبادت یا سروس کا مفہوم مذہب کی دنیا میں کیسے کیا ہوگا۔ جب گرجوں کے وعظ کو سروس (SERVICE) کہا جانے لگا۔ ظاہر ہے کہ یہی کچھ صلوٰۃ کو محض نماز پڑھنے کے معنی میں بدل دینے کے سلسلے میں ہوا ہے۔

جس نظام کو قرآن کریم میں جا بجا صلوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے وہ ایک مومن کا دستورِ حیات یا نہجِ زندگی ہے جس کے قیام سے نوعِ انسانی کی ربوبیت کا انتظام و انصرام مقصود ہے۔ لہٰذا عملی زندگی کے اعتبار سے "صلوٰۃ" کا مفہوم زندگی کے ہر شعبے میں اتباعِ قوانینِ خداوندی ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۱۹/۵۹

پھر بعد میں وہ لوگ آئے۔ جنھوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور اپنے ہی خیالات و مفاد پرستی کا اتباع کرنے لگے۔

یہاں اپنے خیالات ہی کی اتباع کو صلوٰۃ کے ضائع کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تمام افرادِ معاشرہ نظامِ صلوٰۃ کے قیام میں قوانینِ خداوندی ہی کی اتباع کرتے ہیں اور یوں نوعِ انسانی کی ربوبیت عمل میں آتی ہے۔

آیت ۔ وَالَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِیْنَ، میں تمسک بالکتٰب اور اقام الصلوٰۃ دونوں کو مومن کا وظیرۂ زندگی تبلایا گیا ہے۔ گویا تمسک بالکتاب اور اقامت الصلوٰۃ دونوں ایک ہیں۔ اور اس جہت سے ان سے قوانینِ خداوندی کی اطاعت مقصود ہے۔ یہی حقیقت اور بہت سی آیات قرآنی سے مترشح ہوتی ہے۔ آیہ 9 میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر مشرک اپنی غلط روش سے باز آ کر اقامت الصلوٰۃ اور ایتاء الزکوٰۃ میں تمہارے ساتھ شامل ہو جائیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ایک اور مقام پر ہے کہ ایتاء الزکوٰۃ کے پروگرام پر عمل نہ کرنے والے مشرک ہیں (وَیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ) ۔ گویا مومنین اور مشرکین کا فرق یہ ہے کہ مومنین کا مقصود نوعِ انسانی کی ربوبیت (GROWTH) اور اس کا ذریعہ اقامت صلوٰۃ کا نظام ہے۔ یہ دونوں پہلو دین میں ایسے ہی ہیں جیسے دو ستون!

ان آیات کے مفہوم سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ کہ اقامت الصلوٰۃ اور ایتاء الزکوٰۃ ایک ہمہ گیر نظام ہے۔ جس میں افرادِ معاشرہ کی دولت پر کنٹرول اور اس کے ذریعے سے ہر ایک کی مناسب نشوونما عمل میں آتی ہے۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ نماز اور پرستش کی اجازت تو انگریز کی حکومت میں بھی موجود تھی۔ اور فی زمانہ تمام حکومتوں کے (FUNDAMENTAL RIGHTS) میں شامل ہوتی ہے۔ جو نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ دین کی رو سے قائم کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے تمکن فی الارض اور قوت و اختیار کی لازماً ضرورت ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ 22/41 یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ہم انہیں حکومت دیں گے تو یہ صلوٰۃ کے نظام کو قائم کریں گے اور نوعِ انسانی کی نشوونما کا انتظام کریں گے یہاں سے فرمایا گیا کہ محکومی میں کوئی قوم اپنے خدا کا نظام نہیں چلا سکتی۔ دراصل یہی بنیادی جذبہ پاکستان کے حصول کا محرک بنا۔ تاکہ اولاً اس مملکت میں اور بالآخر تمام نوعِ انسانی کے لئے اقامت الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ کے قرآنی نصب العین کی کوشش ہو سکے۔

قرآن کی آیۂ جلیلہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ سے ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ خدا کا ہر وعدہ یقینی اور سچا ہوتا ہے۔ اگر ہم معلوم کرنا چاہیں کہ ہمارا طریق عمل صالح ہے یا نہیں تو صرف یہ دیکھئے کہ ہمیں استخلاف فی الارض ملتا ہے یا نہیں۔ جیسا کہ ہم سے پہلی اقوام کو دیا گیا تھا۔ یہاں قرآن کریم ماضی یعنی تاریخ کے یقینی شواہد کو بطور مثال کے پیش کرتا ہے۔ اسی آیت کے اگلے حصہ میں (وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا) جماعت مومنین کو یہ بتلایا گیا ہے کہ تمہیں حکومت اس لئے دی جائے گی تاکہ اس دین کا تمکن ہو جسے تمہارے لئے پسند کیا گیا ہے۔ اس سے تمہارے خوف امن میں تبدیل ہو جائیں گے اور اس عطائے

ربی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم خلافتِ میرے قوانین کی اتباع کرو گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر مقصودِ دین فقط نماز۔ روزہ یا پرستش ہوتی تو اس کے لئے تمکن اور حکومت کی کہاں ضرورت تھی؟۔

قرآن کی رُو سے رکوع اور سجدہ کے مفہوم کی وسعت بھی قابلِ توجہ ہے۔ آیت ۹۶/۱۹ میں ہے وَلَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔ غیر خدا کی اطاعت نہ کرو۔ صرف اُس کے سامنے جھکو اور یوں قریب ہو جاؤ۔ گویا سجدے کے معنی ہوئے اطاعت کرنا۔ آیہ ۸۴/۲۱-۲۲ میں ہے وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ۝ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَذِّبُونَ ۝ یہاں تکذیب کا لفظ سجدے کے مقابلے میں آیا ہے۔ مفہوم واضح ہے۔ اسی طرح رکوع کے معنی بھی مروّجہ مفہوم سے وسیع تر ہیں۔ آیت ۷۷/۴۸ میں ہے وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ یہاں رکوع کو تکذیب کے مقابلہ میں لایا گیا ہے۔ دراصل رکوع آغازِ اطاعتِ خداوندی ہے اور سجود اس کی انتہا۔ اصل مقصد دونوں کا صلوٰۃ یعنی اتباعِ قوانینِ الٰہی ہے۔

سورہ ابراہیم میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا یہ بتلائی گئی ہے۔ إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ ۱۴/۳۷ میں اپنی اولاد کو بیت الحرم کے پاس اس وادیٔ بے برگ۔ وگیاہ میں بسایا ہوں۔ تاکہ وہ صلوٰۃ کا نظام قائم کریں۔ اس سے یقیناً کسی مقصدِ عظیم کی طرف اشارہ ہے کہ صرف نماز پڑھنے کے لئے اتنے بڑے ایثار کی ضرورت نہ تھی۔

حضرت شعیبؑ نے جب اپنی قوم کو خطاب کیا اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کی رغبت دلائی تو وہ سمجھے کہ یہ صلوٰۃ بھی کوئی پوجا پاٹ کی قسم کی چیز ہوگی۔ لیکن جب انھیں حقیقت سے روشناس کرایا گیا۔ تو کہنے لگے۔ يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ (۱۱/۸۷) کیا تمہاری صلوٰۃ یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آبا و اجداد کے متبارث طریقوں کو چھوڑ دیں، اور اپنے مالوں کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں۔ ۵۔ اصل جہاں کہیں بھی عبادت کا مفہوم پرستش لیا جاتا ہے۔ وہاں آج بھی یہ بات لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ لیکن اس میں ہدایت خداوندی کا کیا قصور؟۔

قرآن کریم متعدد مقامات پر اس امر کی توضیح کرتا ہے کہ افراد کی بیشتر کمزوریاں اور کوتاہیاں ان کے نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ میں منسلک نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور جو لوگ اس نظام کے سچے متبعین یعنی مصلّین ہوتے ہیں۔ وہ ان تمام برائیوں سے بچ جاتے ہیں۔ کیوں کہ اُن کا وطیرۂ حیات لوٹ کھسوٹ یا کچھ لینا نہیں بلکہ دینا ہوتا ہے وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۵۹/۹ وہ ہمیشہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ انھیں تنگی اور مشکل سے گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔

قرآن کریم میں مذکور ہے إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ

الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ إِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (۷۰/۱۹-۲۵) دی کی رہنمائی کے بغیر انسان ایسا بے صبرا اور حریص ہوتا ہے کہ اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اس پر مصیبت آتی ہے تو واویلا مچاتا ہے اور جب وہ ممتول ہوتا ہے تو دولت کو روک کر رکھتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو قرآنی نظام کے صحیح پیرو ہوتے ہیں (مصلین) وہ اس تباہی سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ وہ ہیں۔ جن کے مال میں سائل کا بھی حق ہے (جو باوجود محنت کے بقدر کفایت حاصل نہ کر سکے) اور محروم کا بھی (جو اس قابل ہی نہیں کہ محنت کر سکے) اور حق بھی ایسا واضح اور "معلوم" جسے وہ بطور استحقاق کے طلب کر سکیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نظام صلوٰۃ ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے جس میں انسان کی "ھَلُوْعًا" والی کیفیت "حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ" والی کیفیت سے بدل جاتی ہے۔ اگر آج مسلمانوں کی فرقہ پرستی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر فرقہ اپنی نماز سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ یعنی نماز ان کے تفرقے کا نشان ہے۔ لیکن قرآن کا ارشاد ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۱-۳۲) صلوٰۃ کو قائم کرو۔ اور ان میں سے نہ ہو جاؤ جو فرقوں میں بٹ جاتے ہیں اور خود بھی ایک فرقہ بن کر مطمئن ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ گویا صلوٰۃ کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ ملت فرقوں میں نہ بٹے چنانچہ رسول کریم سے فرمایا گیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۶۰) جو فرقہ بنائیں ان سے تجھے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ لیکن مقام تاسف ہے کہ ہمارے ہاں فرقوں کی نوعیت کی نوبت بایں جا رسید کہ پاکستان کے علمائے کرام ایک مدت سے کوشاں ہیں کہ فرقوں کا وجود قرآنی تعلیم کے علی الرغم آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔

دین کی رُو سے صلوٰۃ و زکوٰۃ کا نظام اور حکومت ایک ہی شے ہے۔ جن کا مدار قرآنی ہدایت کی روشنی میں باہمی مشورے پر ہے۔ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) وہ لوگ جو اپنے رب کے احکام کی بجا آوری میں قیام صلوٰۃ کرتے ہیں اور حکومت کو باہمی مشورے سے چلاتے ہیں۔ چنانچہ دورِ رسالتؐ و خلافتِ راشدہ میں حکومت کے تمام تر معاملات کا مرکز مسجد میں تھا۔ یہی اُن کا پارلیمنٹ ہاؤس تھا۔ جہاں سے باہمی مشورے کے لئے اعلان "اَلصَّلٰوةُ جَامِعَةٌ" (صلوٰۃ کے لئے جمع ہو جاؤ) ہوتا تھا۔ اور دو رکعت نماز باجماعت کے بعد مشورہ ہوتا۔ اور یوں اس اجتماع کا مقصد عظیم ادا ہو جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اجتماعاتِ صلوٰۃ کے رکوع و سجود ذہن میں اطاعتِ خداوندی کی یک رنگی اور یک جہتی کا سمٹا ہوا تصور پیدا کرتے ہیں لیکن اصل غایت اس نظام کی کامل اتباع قوانینِ الٰہیہ میں ایتاء زکوٰۃ ہے۔ یعنی تمام افراد معاشرہ کی نشوونما کا انصرام

کا انتظام اس زندگی میں بھی اور بعد میں آنے والی زندگی کے لئے بھی۔ جب تک یہ نہ ہو ہماری نماز حقیقی صلوٰۃ نہیں بنتی بلکہ تکذیب دین ہی رہتی ہے۔ سورۃ الماعون کے الفاظ میں اَرَاَیْتَ الَّذِیْ ...... اَلْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۱-۷) کیا تم نے ایسے شخص کو بھی دیکھا جو تکذیب دین کرتا ہے۔ یہ وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور مسکین کے کھانے کا انتظام نہیں کرتا۔ سو ایسے مصلین کے لئے تباہی ہے۔ جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اور عملاً ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ ان سرچشموں کو جو تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔ اپنے لئے روک رکھتے ہیں۔

در اصل قرآن کے پیغام میں صلوٰۃ و زکوٰۃ کوئی نئی چیز نہیں۔ تمام انبیاء کرام کی دعوت کا بنیادی مقصد ایک ہی رہا ہے۔ البتہ اس دعوت کی نوعیت ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ تا آنکہ اس کے متعلق مکمل ہدایت رسول کریمؐ کے ذریعے نوع انسانی کو قرآن کی شکل میں دیدی گئی۔ اور قیامت کے لئے محفوظ کر دی گئی

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

بے شک اس کتاب ہدایت کو ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکی

حفاظت کرنے والے ہیں۔

تاریخی شواہد اور قرآن کریم کی متعدد آیات سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی مخالفت ہمیشہ اسی طبقے کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔ جس پر اس کی براہ راست زد پڑتی ہے۔ یعنی مترفین اور اقتدار والے۔ جو خدائے رب العالمین کے بھیجے ہوئے پیغام توحید و ہدایت کے خلاف محاذ کھڑا کرتے ہیں۔ توحید پر ایمان کا اقتضا یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کے قوانین کی اطاعت کی جائے۔ اس کے خلاف زندگی شرک ہے۔ لیکن پیش پا افتادہ مفاد کے پیش نظر انسان اس حقیقت توحید کو اپنی زندگی کا نصب نہیں بنانا چاہتا۔ بقول اقبالؒ

یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

لیکن وہ وقت آ کر رہے گا جب شرک کے جذام (فقدانِ توحید) کا ستایا ہوا انسان قرآن سے توحید کا شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ حاصل کرے گا۔ اس کے ایک ہاتھ میں خدا کے قوانینِ سماوی ہوں گے اور دوسرے میں اس کے قوانینِ معاشی۔ اس روز زمین اپنے ربوبیت دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

حقائق و عبر

۱۔ فرقہ واری اور طلوع اسلام

طلوع اسلام قریب بیس سال سے ملت کے سامنے قرآن کریم کی تعلیم بے لاگ پیش کر رہا ہے۔ یہ تعلیم ہمارے قدامت پرست (مذہبی) پیشوائیت کے حامل گروہ کے مفاد کے خلاف جاتی ہے اس لئے وہ اس کی مخالفت میں ہر ممکن کوشش کرتا چلا آیا ہے۔ طلوع اسلام کا چیلنج ہے کہ جو کچھ اس کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اس کی تردید قرآن کریم سے کی جائے۔ اس کی دعوت کی صداقت کا یہ کتنا بڑا ثبوت ہے کہ مخالفین کی طرف سے آج تک اس کے جواب میں ایک قرآنی آیت بھی پیش نہیں کی جا سکی۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کی طرف سے کوئی قرآنی دلیل پیش نہ کی جا سکے تو وہ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے گا۔ یہ حضرات جو سب سے پست درجے کا حربہ طلوع اسلام کے خلاف استعمال کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ شہور کرتے ہیں کہ طلوع اسلام ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈال رہا ہے۔ حالانکہ طلوع اسلام فرقہ بندی کو از روئے قرآن شرک قرار دیتا ہے۔ جو شخص بزم طلوع اسلام کا ممبر بننا چاہے اسے ایک فارم پر دستخط کرنا پڑتے ہیں جس کی پہلی چار شقیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ بزم طلوع اسلام نہ سیاسی پارٹی ہے اور نہ مذہبی فرقہ۔ یہ ایک اجتماعی اور تنظیمی کوشش ہے اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جسے طلوع اسلام پیش کرتا ہے۔ یہ قرآنی فکر زندگی کے عملی مسائل کا حل علم کی موجودہ سطح کے مطابق براہ راست قرآن کریم سے معلوم کرتا ہے اور اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں انہیں الگ کر کے اس انتظام کی تشکیل کے لئے فضا سازگار بناتا ہے جو عہد محمد رسول اللہ والذین معہ (رضی اللہ عنہم) میں قائم ہوا تھا۔

۲۔ ہر وہ مسلمان جو ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر سے متفق ہو اور ان ہدایات کو تسلیم کرے بزم متعلقہ کی منظوری سے اس کا ممبر بن سکتا ہے۔ ممبری کے فارم رکنیت پر دستخط کرنا ضروری ہوگا۔ اس رکنیت سے

نہ کوئی نیا عقیدہ اختیار کیا جاتا ہے، نہ نئی اطاعت قبول کی جاتی ہے۔ عقائد وہی قابلِ قبول ہیں جن کا تعین قرآن کریم نے کیا ہے اور اطاعت صرف قوانین خداوندی کی واجب ہوتی ہے۔ اس رکنیت سے مقصود یہ ہے کہ یکجہتی اتحادِ فکر، عمل اور نظم وضبط کے ساتھ قرآنی فکر کو عام کیا جائے۔

(۳) ممبرانِ بزم کے لئے اسلامی ارکان کی حتی الامکان پابندی ضروری ہے۔ ان ارکان کی ادائیگی کے لئے جو طریقے مسلمانوں میں رائج ہیں ان میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ جو اعمال و عقائد قرآن کریم کے خلاف ہیں ان سے اجتناب ضروری ہے۔

(۴) ہر ممبر کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی سیرت و کردار کے لئے سیرت نبی اکرمؐ کو بطور نمونہ سامنے رکھے۔۔۔

آپ ان شقوں پر غور کیجئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا ان کی رُو سے کسی نئے فرقے کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے؟ یاد رکھیئے! طلوع اسلام کی طرف فرقہ سازی کو منسوب کرنا، قرآنی فکر کے مخالفین کی بڑی گہری سازش ہے اور اس سے ان کا مقصود یہ ہے کہ اسے عوام میں بدنام کر دیا جائے۔ اس مذموم کوشش میں بعض فتنہ پرداز اس حد تک بھی چلے جاتے ہیں کہ طلوع اسلام کے ڈانڈے "احمدیت" سے ملا دیتے ہیں۔ حالانکہ طلوع اسلام کے نزدیک ختم نبوت کا عقیدہ اسلام کے بنیادی اور اساسی عقائد میں سے ہے اور جو شخص حضور نبی اکرمؐ کے بعد کسی نبی یا رسول کے آنے کا امکان تک بھی تسلیم کرتا ہے اسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ اس کے بعد آپ خود سوچئے کہ طلوع اسلام کو "احمدیت" سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

اسے پھر سن لیجئے کہ طلوع اسلام کے نزدیک قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ وہ نہ کسی مذہبی فرقہ سے وابستہ ہے اور نہ ہی کسی نئے فرقے کی طرح ڈالتا ہے۔ جو ایسا کہتا ہے وہ اس کے خلاف بہتان باندھتا ہے واللہ علی ما نقول شہید۔

۲۔ چمن میں مرے رازداں اور بھی ہیں

۲۴ر جون کی شام کو لاہور کے سینٹ ہال میں ایک مجلس مذاکرہ کا انعقاد ہوا۔ جس میں اسلامی آئیڈیالوجی کے موضوع پر پاکستان کے بعض ممتاز اور فاضل مقررین نے حاضرین سے خطاب کیا۔ اخبارات نے ان تقاریر کو شہ سرخیوں سے شائع کیا۔ زوردار اقتباسات لکھے۔ اور ریڈیو پاکستان ان کے ریکارڈ دور دور تک نشر کرتا رہا۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہمیت قانونی کمیشن کے چیئرمین اور سپریم کورٹ کے فاضل جج ڈاکٹر ایس۔ اے رحمان کے ارشادات کو دی گئی اور ان ارشادات کے اس حصے کو بالخصوص سراہا گیا۔ جس میں جسٹس موصوف نے فرمایا۔

اسلام قوانین کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرتا بلکہ ہر زمانے کی ضروریات اور نصوص قرآنی کے مطابق

یہ قوانین وضع کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح اسلامی نظریے میں استقلال اور تغیر کی دونوں خصوصیات موجود ہیں۔ قرآن حکیم ہمارے لئے قانون سازی کی اٹل اور ناقابل تغیر اساس ہے اور اجتہاد یہ موقع بہم پہنچاتا ہے کہ بدلے ہوئے حالات کے مطابق قوانین کو بدلا جا سکے۔ اجتہاد کا دروازہ جو بدقسمتی سے بند کر دیا گیا ازسرِنو کھلنا چاہیئے۔ تاکہ دورِ جدید میں اسلامی قوانین کو نافذ کرنا ممکن ہو۔

جسٹس ایس اے رحمان کے خطاب کا یہ حقیقت انگیز نکتہ اخبارات اور ملک کے باشعور عناصر سے خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ اور طلوع اسلام اس بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے کہ انھوں نے اس گرانقدر اظہارِ خیال سے اُس انقلاب انگیز دینی موقف کی تائید کی جو قیامِ پاکستان کی صبحِ اول سے نسخۂ شفا کے طور پر ملتِ پاکستان کے حضور میں طلوع اسلام کی طرف سے برابر پیش کیا جا رہا ہے۔

طلوع اسلام کی یہی وہ حقیقت آفریں آواز تھی جس کے جرم میں اُسے مذہبی اجارہ داروں کے عتاب کا شکار بننا پڑا۔ اسی حق گوئی کی خاطر اُسے منکرِ حدیث، منکرِ سنّت اور نہ جانے کن کن خطابات سے نوازا گیا۔ اسی حقیقت کشائی کی سزا میں اس کی رُسوائی کے لئے ہر نوع کے رسوا کن حربے بروئے کار لائے گئے اور اُسے کشتنی و سوختنی قرار دے دیا گیا۔

مملکت کی آئین و قانون سازی کے سلسلہ میں طلوع اسلام نے ابتداء سے اس حقیقتِ مستور کی نقاب کشائی کا فریضہ ادا کیا تھا کہ سرزمینِ پاکستان میں اسلامی نظام کی تشکیل کے لئے جب تک قرآن کے غیر متبدل اصولوں کو اساسی حیثیت نہیں دی جائے گی اور ان اصولوں کے دائرے میں وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے مملکت کے قوانین وضع نہیں کئے جائیں گے۔ خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت کا وہ نقشہ قائم نہیں ہو سکے گا جو حضورِ رسالت مآبؐ کے مقدس ہاتھوں قرنِ اوّل میں متشکل ہوا اور والذین معہٗ کے ذریعے نشو و ارتقاء حاصل کرتا گیا۔ اسی سلسلہ میں ہم نے بارہا اس حقیقت کو دہرایا تھا کہ اسلامی نظام تغیر و استقلال کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔

یہی وہ حقیقت تھی جس کے اظہار پر مذہب گزیدہ عناصر طلوع اسلام کے خلاف بھڑک اٹھے اور وہ شور مچایا کہ الامان والحفیظ۔

لیکن یاد رکھئے! قوموں کے مسائل جذبات کی تندی اور شور و غوغا سے حل نہیں ہوا کرتے بلکہ سنجیدہ فکر کے محتاج ہوتے ہیں تو پھر پاکستان اور عالمِ اسلام کی تاریخ کا یہ اہم ترین مسئلہ شور و شر سے کیسے حل ہو جاتا۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ آئین سازی کی پے در پے اور ناکام کوششوں کے بعد ہم آج بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں بارہ برس پہلے کھڑے تھے۔ مایوسی اور شکست خوردگی کی اس ذہنی کیفیت میں جب جسٹس رحمان نے اصحابِ فکر و بصیرت

کی مجلس مذاکرہ میں طلوع اسلام کے اس موقف کو دہرایا تو حاضرین کے سامنے تاریکی میں ایک کرن سی پھوٹی اور اسے انھوں نے اپنے زخموں کا مرہم پایا۔

ہم بارگاہِ ایزدی میں وفورِ مسرت سے اپنی جبینِ نیاز خم کرتے ہیں کہ طلوع اسلام کی وہی آواز جو ملت کے مسائل کے واحد حل ہے اب بلند پایہ علمی مجالس میں گونجنی شروع ہو گئی ہے اور اس کا خیر مقدم بھی کیا جا رہا ہے۔ ہم اس لازوال یقین سے سرشار ہیں کہ گم کردہ راہ قافلے کو بالآخر اسی نشانِ منزل کی طرف آنا پڑے گا اور اسے دلیلِ راہ کے طور پر قبول کئے بغیر وہ اپنی حقیقی منزل کی طرف گامزن ہونے کے قابل نہ ہو سکے گا۔ وہ دن ملتِ پاکستانیہ کے لئے ہی نہیں بلکہ خود اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے صبح عید ہو گا جب پاکستان کے آئین میں یہ شقیں بطور خشتِ بنیاد رکھی جائیں گی کہ

(۱) پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ العمل نہیں ہو گا جو قرآن کے غیر متبدل اصولوں سے متصادم ہو۔ اور

(۲) مملکت کے ہر فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی اور اس کی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری وسائل و ذرائع کا بہم پہنچانا مملکت کی بنیادی ذمہ داری ہو گی۔

یہی پاکستان کی آئیڈیالوجی ہے اور اسی سے یہ مملکت اسلامی بنے گی۔

سیکولر اسٹیٹ

آجکل سیاسی حلقوں میں "سیکولر اسٹیٹ" کی اصطلاح عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اسے آپ نے طلوع اسلام کے صفحات پر بھی متعدد بار لکھا ہو گا۔ اس اصطلاح کے صحیح مفہوم کے سمجھنے میں ایک غلط فہمی پائی جاتی ہے جس کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ازمنہ متوسط میں ایک اندازِ حکومت ظہور میں آیا تھا جسے تھیاکریسی کہتے ہیں۔ اسی طرزِ حکومت میں اقتدارِ اعلیٰ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں رہتا تھا جو "خدا کے نام پر" لوگوں سے اپنی اطاعت کراتے تھے۔ جب یورپ ان خدائی فوجداروں کے ہاتھ سے تنگ آیا تو وہاں اس طرزِ حکومت کے خلاف ایک جدید اندازِ حکومت وضع ہوا جس میں مذہبی پیشواؤں کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس اندازِ حکومت کو سیکولر کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا۔ مذہبی پیشواؤں نے اسے لادینی حکومت کہہ کر بدنام کرنا شروع کر دیا۔ اس نقطۂ نگاہ سے آپ دیکھیں گے تو اسلامی حکومت خود سیکولر اسٹیٹ نظر آئے گی۔ اس لئے کہ اس مملکت میں بھی مذہبی پیشوائیت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مذہبی پیشوائیت کا تصور ہی غیر قرآنی اور خلافِ اسلام ہے۔

لیکن رفتہ رفتہ سیکولر اسٹیٹ کا مفہوم بدلتا گیا۔ اس سے ایک ایسی حکومت مراد لی جانے لگی جو کسی غیر متبدل اصول یا مستقل قدر کی پابند نہ ہو بلکہ حکومت اپنے معاملات وقتی تقاضوں کے مطابق جیسے مناسب سمجھے طے کرتی رہے۔ آجکل یہ اصطلاح عام طور پر انہی معانی میں استعمال ہوتی ہے مملکت کا یہ تصور اسلام کے یکسر خلاف ہے اور اس نقطۂ نظر سے سیکولر اسٹیٹ اسلامی مملکت کی ضد اور نقیض ہے۔ طلوع اسلام میں سیکولر اسٹیٹ کی اصطلاح انہی معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔

قربانی

کوئی دس سال ادھر کا ذکر ہے، طلوع اسلام نے ملک کے سامنے اس حقیقت کو واشگاف کیا تھا کہ ہمارے ہاں عیدالاضحیٰ پر ہر جگہ جو قربانیاں دی جاتی ہیں، قرآن کریم نے کہیں اس کا حکم نہیں دیا۔ قرآن میں حج کی تقریب پر مکہ میں جانور ذبح کرنے کا ذکر آیا ہے اور وہ بھی اس مقصد کے لئے کہ اس وادیٔ غیر ذی زرع میں جمع ہونے والے کثیر التعداد لوگوں کی غذا کا انتظام ہو سکے۔ اس نے ان جانوروں کے لئے قربانی کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا (حالانکہ یہ لفظ عربی زبان کا ہے اور قرآن میں دوسرے مقامات پر اس کا استعمال بھی آیا ہے)۔ طلوع اسلام نے اس موضوع پر شرح و بسط سے لکھا اور دلائل و براہین سے اس حقیقت کو پیش کیا۔ اس کا جواب تو کسی سے بن نہ پڑا لیکن قدامت پرست گروہ کی طرف سے اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ اس مخالفت میں کچھ لوگ تو وہ تھے جو اپنی سادہ لوحی اور عدم واقفیت کی بنا پر قربانی کو فی الواقعہ واجب دینی مانتے تھے لیکن بیشتر طبقہ ان مذہبی دکانداروں کا تھا جن کا کاروبار قربانی کی کھالوں پر چلتا ہے۔ ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ (مثلاً) حج فریضہ ہے اور قربانی (خود ان کے فتویٰ کے مطابق) سُنّت۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فرض بہرحال سُنّت سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ یہ لوگ قربانی کے متعلق خطبات ارشاد فرمائیں گے۔ وعظیں کہیں گے۔ مضامین لکھیں گے۔ پمفلٹ شائع کریں گے۔ اشتہارات لگائیں گے۔ ڈھنڈورے پٹوائیں گے۔ لیکن آپ نے انہیں حج کے متعلق کبھی ایک لفظ کہتے بھی نہیں سنا ہوگا۔ اس لئے کہ حج سے انہیں یا انکے کچھ نہیں اور قربانی کی کھالوں سے ان کے بجٹ تیار ہوتے ہیں۔

یہ مخالفت ہوتی رہی لیکن طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ حقیقت اپنا اثر کرتی چلی گئی۔ مخالفین اس کے متعلق یہ کہہ کر عوام کو فریب دیتے رہے کہ یہ آوازیں مغرب زدہ "مسٹروں" کے طبقہ سے اٹھ رہی ہیں۔ کوئی عالم دین ان کا ہم نوا نہیں۔

لیکن حقیقت کا زور دیکھو ملاحظہ فرمائیے کہ اس سال لاہور کی شاہی مسجد کے منبر سے، اس کے خطیب مولانا غلام مرشد کی زبان سے (جو فاضل دیوبند اور مسلّمہ عالم ہیں) یہ آواز ملک کے گوشے گوشے تک پہنچ گئی کہ عیدالاضحیٰ پر جانوروں کا ذبح کوئی دینی فریضہ نہیں۔ لوگوں کو چاہیئے کہ جانور کی مالیت کی رقم قومی فنڈ میں جمع کریں اور حکومت اس فنڈ کو اپنی تحویل میں لے کر اسے رفاہِ عامہ کے کاموں میں صرف کرے۔

مولانا غلام مرشد صاحب نے جو تجویز پیش کی ہے اس سے مروجہ قربانی کی اصل ختم ہو جاتی ہے اور یہی وہ نکتہ تھا جسے طلوع اسلام نے پیش کیا تھا کہ قرآن نے کہیں اس طرح جانور ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا۔

قدامت پرست گروہ کی طرف سے مولانا غلام مرشد صاحب کی تجویز کی بھی مخالفت شروع ہو گئی ہے (اور یہ مخالفت قابلِ فہم ہے)۔ لیکن ان حضرات کی نگاہوں سے یہ حقیقت اوجھل ہے کہ جس عقیدہ و نظریہ۔ مسلک و مشرب۔ یا رسم و رواج کی سند قرآن سے نہیں ملتی وہ دنیا میں باقی نہیں رہ سکتا۔ اسے خدا کا کائناتی قانون خود مٹا دیتا ہے۔ اس قانون کی رفتار ہمارے حساب و شمار کے مطابق بہت سُست ہوتی ہے لیکن وہ اپنے فریضہ سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ طلوع اسلام یا شاہی مسجد

کے خطیب، وہ ذرائع یا محسوس اسباب ہیں جن کی وساطت سے یہ قانون اپنے فیصلے عمل میں لاتا ہے۔ اس لئے ان ذرائع کی مخالفت کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ قرآن، خدا کی کتاب ہے اور کائناتی قانون، خدا کا فیصلہ۔ اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ جو بات خدا کی کتاب کے خلاف ہو، کائناتی قانون اس پر گرفت نہ کرے۔ ہمارے مروجہ مذہب میں جتنی چیزیں ایسی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں، خدا کا کائناتی قانون (زود یا بدیر) انہیں مٹا کر رہے گا۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو چیز قرآن کے خلاف ہے وہ کبھی نبی اکرمؐ کی سُنّت نہیں ہو سکتی۔ یاد رکھئے۔ طلوعِ اسلام نہ منکرِ حدیث ہے نہ منکرِ سُنّت۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ جو بات قرآن کے خلاف ہو وہ کبھی رسول اللہؐ کی حدیث یا حضورؐ کی سُنّت نہیں ہو سکتی۔

طلوعِ اسلام کے فائل مطلوب ہیں

طلوعِ اسلام کی جلد ۱ تا ۹ کے مکمل فائل یا متفرق پرچے مطلوب ہیں۔ جو صاحب فروخت کرنا چاہیں ذیل کے پتہ پر خط لکھدیں۔

محمد اقبال انصاری۔ انسٹی ٹیوٹ اوف اسلامک اسٹڈیز۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ (انڈیا)

ماہنامہ میثاق لاہور

ضخامت ۵۶ صفحات

تقطیع ۲۰×۲۶/۸

زیرِ ادارت

مولانا امین احسن اصلاحی

اسلام پر بلند پایہ علمی و تحقیقی مضامین کے علاوہ مولانا اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن اور تزکیۂ نفس کا سلسلۂ مضامین میثاق کی نمایاں خصوصیات ہونگی

سالانہ چندہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پہلا شمارہ شائع ہو چکا ہے

مراسلت و ترسیلِ زر کا پتہ: منیجر ماہنامہ میثاق رحمان پورہ اچھرہ۔ لاہور

رابطۂ باہمی

کنونشن کی حساب فہمی

(۱) کنونشن کے لئے برتن خریدنے کے سلسلہ میں مختلف بزموں کی طرف سے جو رقم موصول ہوئی تھی (اور جس کی تفصیل اس سے قبل طلوع اسلام میں شائع ہو چکی ہے) اس کی میزان -/۱۱۱۱ روپے تھی۔ اس کے بعد حسب ذیل رقوم مزید وصول ہوئیں۔

نوانکلی	-/۳۰ روپے	
چارباغ	-/۱۵ "	(یعنی کل -/۲۵ روپے)
ٹنڈو محمد خاں	-/۲۵	
لائلپور	-/۵۰	
	-/۱۲۰	میزان کل -/۱۲۳۱ روپے
برتن خریدنے کا خرچ	-/۱۳۲۴ روپے	(اس کی تفصیل کنونشن کے کاغذات میں موجود ہے)
بقایا واجب الادا	-/۹۳/۶	

۲۔ کنونشن کا حساب

کل آمد مندوبین	-/۱۵۰۰
آمد مبصرین	-/۸۱۰
میزان	-/۲۳۱۰
خرچ کنونشن	۶ — ۷ — ۲۶۸۷

بقایا واجب الادا		۶ — ۷ — ۳۷۷
کل بقایا واجب الادا		۰ — ۶ — ۹۳
		۶ — ۷ — ۳۷۷
		۶ — ۱۳ — ۴۷۰ (یہ روپیہ کنونشن کے ذمہ واجب الادا ہے)

[نوٹ:- کنونشن کی آمد و خرچ کی جملہ تفاصیل کاغذات میں موجود ہیں]

۳۔ کنونشن میں اپیل کی گئی تھی کہ کرسیاں وغیرہ خریدنے کے سلسلہ میں فنڈ جمع کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل وعدے ہوئے تھے۔ (ان میں سے جو رقوم ۲۰ر جون ۱۹۵۹ء تک وصول ہو چکی ہیں ان کے سامنے "وصول" لکھ دیا گیا ہے)

بزمیں

۱۔	ہنگو	۰ — ۰ — ۱۰	وصول
۲۔	لاہور	۰ — ۰ — ۵۰۰	
۳۔	سیالکوٹ	۰ — ۰ — ۵۰	
۴۔	چنیوٹ	۰ — ۰ — ۵۰	
۵۔	ضلع جہلم	۰ — ۰ — ۱۰	
۶	سیدسین ضلع جہلم	۰ — ۰ — ۱۰	
۷۔	پنڈدادنخان	۰ — ۰ — ۱۰	وصول
۸۔	کراچی	۰ — ۰ — ۱۰۰۰	
۹۔	چونڈہ	۰ — ۰ — ۱۰	
۱۰۔	سیالکوٹ چھاؤنی	۰ — ۰ — ۱۰	
۱۱۔	مردان	۰ — ۰ — ۲۰۰	
۱۲۔	سمندری	۰ — ۰ — ۱۰	
۱۳۔	چک ۱۰ شمالی سرگودھا	۰ — ۰ — ۱۰	
۱۴۔	پنڈی	۰ — ۰ — ۱۰۰	
۱۵	گوجرہ	۰ — ۰ — ۱۰	وصول

۱۶-	شیخوپورہ	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵
۱۷-	ٹنڈو محمد خاں	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵

انفرادی

۱-	حاجی فقیر محمد صاحب	مردان	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰۰	وصول
۲-	تجمل حسین صاحب	جھنگ	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵	
۳-	چوہدری افتخار احمد صاحب	لاہور	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵	
۴-	محمد یامین صاحب	ملتان	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰	
۵-	مبشر یزدز دین صاحب سکھو چک	سیالکوٹ	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰	وصول
۶-	عبدالکریم صاحب	ننکانہ	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵	"
۷-	بہزاد خاں صاحب	ٹیکسلا	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵	"
۸-	غلام ربانی صاحب	ٹیکسلا	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵	"
۹-	محمد شفیع صاحب	واہ	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰	"
۱۰-	نجابت خاں صاحب	واہ	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰	
۱۱	چوہدری عمر حیات صاحب ٹھیکیدار	گوجرانوالہ	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰	وصول

میزان	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۳۵۵
وصول شدہ	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۸۵
واجب الوصول	۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰۷۰

(چوہدری) عبدالرحمٰن (صدر کونشن کمیٹی)

ماہانہ رپورٹیں

(مری، جلالپور جٹاں، گوجرانوالہ اور ننکانہ میں نئی بزمیں قائم ہوئی ہیں۔ ادارہ ان بزموں کے قیام پر باضابطہ مہر تصدیق ثبت کرتا ہے)

مری۔ ۲۳، ۲۴ مئی کو مری کی گلپوشس وادیوں میں قرآنی فکر کی تنظیمی صورت بروئے کار

ملنے کے لئے احباب ضلع کے اہم اجتماعات ہوئے۔ اس موقع پر "اقبال اور مقام آدمیت" اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے سلسلہ میں حاضرین کو محترم پرویز صاحب کے وہ ٹیپ ریکارڈ سنائے گئے جو موصوف نے کنونشن کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ ان خطابات نے تاثر کا ایک سماں باندھ دیا اور اس سب کنونشن کی آخری نشست میں مقامی بزم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ محترم مضطر عباسی صاحب بزم کے ترجمان چنے گئے۔

جلالپور جٹاں
قرآنی فکر سے وابستہ احباب کا اجتماع ۲۹ مئی کی سہ پہر کو ہوا اور اس اجتماع میں بزم کا باضابطہ قیام عمل میں لایا گیا۔ دیہات کے احباب بھی شریک اجلاس ہوئے۔ ڈاکٹر حبیب اللہ صاحب بزم کے ترجمان منتخب کئے گئے۔

ننکانہ
۵ جون بروز جمعہ شمع قرآنی کے پروانوں کا پہلا اجتماع قیام بزم کے سلسلہ میں ہوا۔ شیخوپورہ سے محترم غلام جیلانی محترم ظہیر سیالکوٹی کی معیت میں شریک اجلاس ہوئے۔ بزم کی باقاعدہ تشکیل کے بعد برکت علی خاں صاحب غیور ترجمان چنے گئے۔

گوجرانوالہ
۵ جون کو مقامی احباب کے ایک اہم اجتماع میں بزم کا باضابطہ قیام زیر عمل لایا گیا۔ محترم خواجہ محمد حسین صاحب ترجمان منتخب ہوئے۔ مختلف پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔

ڈیرہ غازیخاں
۱۴ جون کو بزم کا ہفت روزہ اجلاس ہوا اور طے پایا کہ ماہ جون کے لمعات زیادہ سے زیادہ تعداد میں طبع کرا کر تقسیم کئے جائیں اور درس قرآن کا سلسلہ از سر نو پھر شروع کیا جائے۔

ہنگو
بزم کی طرف سے پمفلٹ مفت تقسیم کئے جا رہے ہیں اور عوام نے طلوعِ اسلام کے مقصد و مسلک کا خاطر خواہ اثر قبول کیا ہے۔ کرونغہ کی لائبریری اور پی۔ ٹی۔ ایس کے لئے طلوع اسلام جاری کر دیا گیا ہے۔

پنڈدادنخاں
مختلف پمفلٹ عوام میں مفت تقسیم کئے گئے۔ اور کتابیں برائے مطالعہ دی گئیں۔ بزم میں نئے احباب کا اضافہ ہو رہا ہے۔

شیخوپورہ
پمفلٹ بذریعہ ڈاک و دستی تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ اور قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے ایک مؤثر پروگرام اس ماہ بروئے کار لایا جا رہا ہے۔

ضلع جھنگ
چنیوٹ میں بزم کی قائم کردہ لائبریری سے احباب اور دیگر حضرات بخوبی مستفید ہو رہے ہیں۔ لائبریری میں مزید کتب کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ پچیس پمفلٹ مفت تقسیم کئے گئے۔ مرکز ضلع (مگھیانہ) میں بھی ادارے کی مطبوعات اور طلوع اسلام برائے مطالعہ دیئے جا رہے ہیں۔

ٹنڈو محمد خاں بزم برابر سرگرم عمل ہے اور فکر قرآنی کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں طلوع اسلام اور دیگر مطبوعات تقسیم کر رہی ہے۔

سید حسین بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔ طلوع اسلام اور دیگر پمفلٹ برائے مطالعہ تقسیم کئے جاتے ہیں۔ لائبریری میں طلوع اسلام کا تمام لٹریچر مکمل طور پر جمع رکھنے کے لئے اراکین بزم سے مالی امداد طلب کی گئی ہے۔

لائلپور ضلعی بزم کا اجلاس ۷ مئی کو ریلوے روڈ پر ہوا۔ سمندری اور گوجرہ کی بزموں نے مرکزی ضلعی بزم سے پورے پورے تعاون کا عزم کیا ہے۔ یکصد روپے کی کتابیں اور پمفلٹ برائے تقسیم خرید کئے گئے اور ان کی تقسیم کا سلسلہ جاری ہے۔ محترم مختار الجلیل کی امداد سے ٹیپ ریکارڈنگ مشین کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ تاکہ پرویز صاحب کی تقاریر اراکین بزم کو سنائی جا سکیں۔

چک عثمانی بزم کے احباب کی فکری تربیت کے سلسلہ میں انھیں پمفلٹ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ بھلوال (ضلع سرگودھا) کے قصبہ میں بھی لٹریچر کی تقسیم جاری ہے۔

واہ کینٹ۔ ۱۶ مئی کی شب اور اگلی صبح کو بزم کے دو اہم اجتماع ہوئے۔ بارش اور خنکی کے باوجود احباب نہ صرف خود شریک ہوئے بلکہ دیگر دوستوں کو بھی ساتھ لائے۔ ہر دو اجتماع بڑے کامیاب اور موثر ثابت ہوئے۔ پرویز صاحب کی تقریروں کے ریکارڈ بڑے جذب و انہماک سے سنے گئے

کراچی بزم نے پی ایم اے بلڈنگ میں ہال کا انتظام کر لیا ہے جہاں ہر اتوار کی صبح درس قرآن ہوتا ہے جس میں محترم پرویز صاحب کے ریکارڈ شدہ قرآنی درس سنائے جاتے ہیں۔ یہ پروگرام بڑا مفید، موثر اور جاذب ثابت ہوا ہے۔ شرکاء کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

اسلامی تاریخ کی انقلاب انگیز و عہد آفریں کتاب

خلافتِ معاویہ و یزید

یعنی اموی خلافت کا پس منظر، خلافت و سیرت امیر معاویہ و یزید۔ حادثۂ کربلا و فتنۂ حرّہ پر محمود احمد صاحب عباسی کی بے لاگ تحقیق و ریسرچ۔

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت زائد ۴۰۰ صفحات مجلد قیمت چھ روپے فی جلد

ملنے کا پتہ:۔ کارخانہ تجارتِ کتب آرام باغ۔ کراچی